پاکستان

بیورو برائے جمہوریت، انسانی حقوق اور محنت

مذہبی آزادی پر عالمی رپورٹ برائے سال 2010ء

17 نومبر 2010ء

آئین میں اسلام کو مملکت کا مذہب قرار دیا گیا ہے جس کے تحت تمام قوانین کا اسلام سے ہم آہنگ ہونا لازمی ہے۔ آئین کہتا ہے کہ ''ہر شہری کو قانون، امن عامہ اور اخلاقیات کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے مذہب پر عمل کرنے، اس کی ترویج کرنے کی آزادی حاصل ہے''، تاہم عملی طور پر حکومت نے مذہبی آزادی کو محدود کر رکھا ہے۔ آئینی طور پر اظہار رائے کی آزادی بھی اسلام کی عظمت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے قانون کے تحت لگائی جانے والے پابندیوں کا احترام کرنے سے مشروط ہے۔

مذہبی اقلیتوں کے تحفظ کے سرکاری اقدامات سے قطع نظر زیرِ نظر رپورٹ کی تیاری کے عرصے میں اقلیتوں کے خلاف کی جانے والی کاروائیوں کی تعداد، اور اُن کی سنگینی میں اضافہ ہوا ہے۔ اقلیتوں کے خلاف منظّم تشدد بڑھ چکا ہے، مثال کے طور پر پنجاب میں کوجرہ کے مقام پر عیسائیوں پر تشدد کیا گیا، پنجاب ہی میں لاہور میں احمدیوں پر دہشت گردوں نے حملہ کیا۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکاروں کی جانب سے مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے زیرِ حراست قیدیوں کے ساتھ بدسلوکی کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ سیکورٹی فورسز اور دیگر سرکاری ادارے اقلیتوں کے ساتھ معاشرتی سطح پر روا رکھی جانے والی بدسلوکی کو مؤثر طور پر روکنے یا اس کا ازالہ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

امتیازی قوانین اور سماجی سطح پر مذہبی اقلیتوں کے خلاف نفرت انگیز اقدامات کرنے والے عناصر کی بیخ کنی میں حکومت کی ناکامی یا اُس کی جانب سے تاخیر کی وجہ سے مذہبی اقلیتوں کے خلاف تعصب، تشدد کے واقعات اور مذہبی عدم برداشت میں واضح اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ مذہبی اقلیتوں کے خلاف امتیازی قوانین کی تعزیرات میں احمدیوں کے خلاف شامل کی جانے والی شقیں اور اسلام یا اُس کے پیغمبروں کی توہین کرنے پر سزائے موت کا قانون قابل ذکر ہے۔ احمدیہ فرقے کے لوگوں کو اپنے مذہبی عقائد پر عمل کرنے کی راہ میں سماجی امتیازی سلوک اور قانونی پابندیوں کا سامنا ہے۔ عیسائیوں، سکھوں اور ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے دیگر فرقوں کی جانب سے بھی سرکاری اور سماجی سطحوں پر امتیازی سلوک کی شکایات موصول ہوتی رہتی ہیں۔

مختلف مذہبی گروہوں کے مابین تعلقات کشیدہ رہے۔ مذہبی اقلیتوں کے خلاف سماجی سطح پر بڑے پیمانے پر امتیازی سلوک روا رکھا گیا اوران گروپوں کو معاشرے میں پُرتشدد رویّوں کا بھی سامنا رہا۔ دہشت گرد اور انتہا پسند گروہوں اور افراد سمیت غیر سرکاری کرداروں نے مذہبی اجتماعات کو نشانہ بنایا۔ مقامی سطح پر مذہبی جنگجوؤں کی سرگرمی میں رونما ہونے والی باغیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے مذہبی اقلیتوں کے خلاف تشدد اور اُنھیں خوفزدہ کرنے کی کارروائیوں اضافہ ہوا اور پہلے سے موجود فرقہ ورانہ کشیدگی کو ہوا ملی۔ انتہا پسندوں کا مطالبہ تھا کہ تمام شہری ایک سخت گیر اسلام کی تعلیمات پر عمل کریں بصورتِ دیگر انہیں سنگین نتائج کا سامنا کرنا کی دھمکی دی۔ انتہا پسندوں نے تصوف کے پیروکاروں سمیت رواداری اور اجتماعیت کا پرچار کرنے والے مسلمانوں کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا۔

امریکی حکومت انسانی حقوق کے تحفظ کی مجموعی پالیسی کے حوالے سے حکومتِ پاکستان کے ساتھ مذہبی آزادی پر گفت وشنید کرتی رہی ہے۔ زیرِنظر رپورٹ کی تیاری کے عرصے میں امریکی سفارتخانہ کے حکام مذہبی اقلیتوں کے ساتھ روا رکھنے والے سلوک کا بغور جائزہ لیتے رہے، انھوں نے مذہبی عدم برداشت پر مبنی تعلیمات کے خاتمے کیلئے کام کیا اور انہوں نے توہینِ رسالت کے قوانین کے خاتمے یا ان میں ترمیم کرنے کی حوصلہ افزائی بھی کی۔

سیکشن 1۔ مذہبی اعداد وشمار:

ملک کا رقبہ تین لاکھ دس ہزار پانچ سو ستائیس مربع میل اور آبادی سترہ کروڑ چالیس لاکھ ہے۔ کم وبیش پچانوے فیصد آبادی مسلمان ہے (جس میں 75 فیصد سنی اور 25 فیصد شیعہ ہیں) آبادی کا پانچ فیصد یا اس سے کچھ کم ہندوؤں، عیسائیوں، پارسیوں/ زرتشتیوں، بہائیوں، سکھوں، احمدیوں، بدھ مت کے پیروکاروں اور کچھ دوسرے گروہوں پر مشتمل ہے۔ وزارت اقلیتی اُمور کے مطابق سکھوں کی تعداد تقریباً تیس ہزار اور بدھ مت کے ماننے والوں کی تعداد بیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ کراچی میں پارسی برادری کے مرکز کے مطابق پارسیوں/ زرتشتیوں کی تعداد، جو کہ جون 2006ء میں دو ہزار انتالیس تھی، کم ہو کر 2010ء میں ایک ہزار سات سو پچاس رہ گئی ہے۔ بہائیوں کا دعویٰ ہے کہ ان کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اور اب اس مذہب کے ماننے والوں کی تعداد تیس ہزار تک پہنچ چکی ہے۔

جماعت احمدیہ کے مطابق ملک میں آباد احمدیوں کی تعداد تقریباً چھ لاکھ ہے۔ درآں حالیکہ ان کی تعداد کا صحیح تخمینہ لگانا مشکل ہے اگرچہ قانوناً احمدی اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہلوا سکتے اس لئے عموماً وہ اپنے آپ کو غیر مسلم کہلوانے سے گریز کرتے ہیں، بلوچستان اور صوبہ خیبر پختونخوا (جسے پہلے شمالی مغربی سرحدی صوبہ کہا جاتا تھا) میں کچھ قبیلے قدیم روایتی مذہبی عقائد پر عمل کرتے ہیں دوسرے مذہبی گروہوں میں کلاشا، کیہال اور جین مت کے پیروکار شامل ہیں۔ 1998ء کی مردم شماری میں اعشاریہ پانچ فیصد سے بھی کم آبادی نے اپنی مذہبی وابستگی کے بارے میں خاموشی اختیار کی یا دعویٰ کیا کہ وہ کسی مذہبی گروہ سے تعلق نہیں رکھتے۔ سماجی دباؤ اس قدر زیادہ ہے کہ چند ہی لوگ دعویٰ کر پائے ہیں کہ ان کا کوئی مذہب نہیں ہے۔

اگرچہ مذہبی عبادات یا تقریبات میں عملی شرکت کرنے والی آبادی کے بارے میں اعداد وشمار دستیاب نہیں ہیں تاہم مذہبی عقائد روزمرہ زندگی کے معاملات میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، مسلمانوں کی اکثریت نماز جمعہ ادا کرتی ہے۔ (جمعہ اسلام میں مقدس دن ہے) خاصی بڑی تعداد میں لوگ باقاعدگی سے روزانہ نمازیں ادا کرتے ہیں، رمضان المبارک کے مہینے میں ایسے مسلمان بھی روزہ رکھتے اور نماز پڑھتے ہیں، جو

عام طور پر مذہب پر کم ہی عمل کرتے ہیں، انگریزی بولنے والے ستر فیصد رومن کیتھولک باقاعدگی سے عبادت کرتے ہیں، اس سے کہیں کم تعداد میں اردو بولنے والے کیتھولک عبادت میں شریک ہوتے ہیں۔ تقریبات کے دوران میں ہندو اور سکھ مذہبی عبادات میں شریک ہونے والوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔

سیکشن II۔ حکومت کی طرف سے مذہبی آزادی کے احترام کی حیثیت:

قانونی/ پالیسی ڈھانچہ:

آئین کی رو سے اسلام مملکت کا سرکاری دین ہے۔ اس میں یہ صراحت بھی کی گئی ہے کہ اقلیتوں کو اپنے مذہبی عقائد رکھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی آزادی کو یقینی بنایا جائے گا۔ تاہم حکومت نے مذہبی آزادی، بالخصوص احمدیوں، پر کچھ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔

مذہبی جماعتوں نے آئین میں ایسی ترامیم کی مخالفت کی جن سے اسلامی دفعات، بالخصوص احمدیوں کے حوالے سے، متاثر ہوتی ہوں۔ اپریل 2010ء آئین میں اٹھارویں ترمیم اقلیتوں کو متاثر کرنے والی دفعات، جن میں توہین رسالت اور احمدیوں کیلئے مخصوص قوانین شامل ہیں، کو تبدیل کئے بغیر پاس کی گئی۔

اظہار رائے کی آزادی تعزیرات پاکستان کی شق 295اے بی اور سی کی رو سے ''اسلام کی عظمت و وقار'' کے پیش نظر بعض ''مناسب'' پابندیوں سے مشروط ہے۔ اسلام یا اس کے پیغمبروں کی توہین کی صورت میں ملک کے توہین رسالت کے قوانین کی رو سے سزائے موت دی جا سکتی ہے۔ قرآن مجید کے نسخہ کو پھاڑنے، اسے نقصان پہنچانے یا اس کی بے حرمتی کرنے کی صورت میں عمر قید، اور کسی دوسرے کے مذہبی عقائد کی توہین کرنے کی صورت میں دس سال قید کی سزائیں دی جا سکتی ہیں۔ کچھ لوگ غریب اور مفلوک الحال مسلمانوں، مخالف فرقے اور مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد سے اپنی ذاتی دشمنیوں کا بدلہ لینے یا دباؤ ڈالنے کے لئے ان قوانین کا سہارا لیتے ہیں۔ انسداد دہشت گردی ایکٹ کے تحت مذہبی نفرت پھیلانے کا کوئی بھی اقدام، بشمول تقریر، سات سال قید کا موجب بن سکتا ہے۔ کسی مذہبی اقلیت کی طرف سے اس دعویٰ کی صورت میں کہ اس کے مذہبی جذبات مجروح کئے گئے ہیں، توہین کے قوانین کا اطلاق شاذ و نادر ہی کیا گیا۔ اسی طرح سے بہت کم واقعات عدالتوں میں زیر بحث لائے گئے۔ 2005ء کے ایک قانون کے تحت لازم ہے کہ توہین کے الزامات کے تحت مقدمہ درج کرنے سے پہلے ایک سینئر پولیس آفیسر معاملے کی تحقیقات کرے گا، یہ قانون یکساں طور پر لاگو نہیں کیا گیا ہے۔

توہین رسالت کا قانون عیسائیوں، احمدیوں اور مسلمانوں سمیت دیگر مذہبی گروہوں کے خلاف استعمال ہوتا رہا ہے۔ نچلی عدالتوں میں توہین کے مقدمات میں شہادتوں کے ناکافی ہونے کی کم ہی پروا کی جاتی ہے۔ اس وجہ سے زیر سماعت مقدموں کے ملزموں اور مختلف سزائیں پانے والے مجرموں کو برسوں قید و بند کی صعوبتیں جھیلنا پڑتی ہیں تاوقتیکہ اعلیٰ عدالتیں ان کی سزا ختم کرنے یا انہیں بیگناہ قرار دے کر رہا کرنے کے احکامات جاری نہیں کر دیتیں۔ عام طور پر توہین کے مقدمات کی سماعت کرنے والی ابتدائی عدالتیں اس بنیاد پر ملزموں کو ضمانت پر رہا نہیں کرتیں کہ چونکہ انہیں سزائے موت ہو سکتی ہے اس لئے وہ فرار ہو جائیں گے۔ تاہم اب تک مملکت نے کسی فرد کو توہین رسالت کے الزام میں سزائے موت نہیں دی ہے۔ بہت سے مدعا علیہان ضمانت کی درخواستوں کو مسترد کئے جانے کے خلاف اپیل کرتے ہیں۔ لیکن مقدمہ چلنے سے پہلے اکثر و بیشتر ضمانت پر رہائی نہیں دی جاتی۔ نچلی عدالتوں میں انتہا پسند عناصر کے خوف سے فیصلوں میں تاخیر دباؤ اور دھونس اور ضمانت کی درخواستوں کو

منظور نہ کرنا معمول بن چکا ہے۔

تعزیراتی قوانین میں اسلامی قانون (شریعت) کی کئی شقیں شامل کی گئی ہے۔عدالتی نظام مختلف نظام ہائے انصاف کا ایک ایسا گنجلک ملغوبہ ہے جس میں دیوانی، فوجداری اور اسلامی قوانین ایک دوسرے کے دائرہ کار میں مداخلت کرتے اور مدغم ہوتے دکھائے دیتے ہیں۔ وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کا شرعی بنچ حدود آرڈیننس کے تحت سنائی جانے والی مختلف سزاؤں کے خلاف اپیلوں کی سماعت کرتے ہیں۔ حدود آرڈیننس میں زنا، شادی شدہ ہوتے ہوئے دوسروں سے جنسی تعلقات قائم کرنے، جائیداد کے حوالے سے جنم لینے والے جرائم، جوا کھیلنے اور شراب پینے جیسے جرائم کیلئے سزائیں رکھی گئی ہیں اور ان عدالتوں کے جج اور پیش ہونے والے وکلاء کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔2005ء میں سپریم کورٹ نے ایک فیصلہ سنایا تھا جس کی رو سے سپریم کورٹ کا فل بنچ شرعی بنچ کو بائی پاس کر کے پیش کی جانے والی اپیلوں کی سماعت کر سکتا ہے۔اسی طرح سے وہ ہائی کورٹس کے فیصلوں پر نظر ثانی کرنے سے وفاقی شرعی عدالت کو روک بھی سکتا ہے۔وفاقی شرعی عدالت کسی بھی ایسی قانون سازی کو ختم کر سکتی ہے جو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ نہ ہو۔اس قسم کے مقدمات میں سپریم کورٹ کے شرعی بنچ میں اپیل دائر کی جا سکتی ہے اور عین ممکن ہے کہ سپریم کورٹ کا فل بنچ اس اپیل کی سماعت کرے، وفاقی شرعی عدالت حدود کے قوانین کے تحت دائر مقدمات میں مسلمانوں اور غیر مسلموں ہر دو کو طلب کر سکتی ہے۔غیر مسلم کسی بھی ایسے معاملے میں وفاقی شرعی عدالت سے رجوع کر سکتے ہیں، جس سے وہ متاثر ہوتے ہوں یا جس سے ان کے حق تلفی ہو رہی ہو۔

فوجداری قانون کے تحت جرم کا ارتکاب کرنے والے متاثرہ فرد یا خاندان کو مالی معاوضہ دینے کی پیشکش کر سکتے ہیں، اسی طرح سے متاثرہ فرد یا خاندان کو اجازت ہے کہ وہ عدالتی نظام کے تحت دی جانے والی سزا کے بجائے مالی جرمانے کی صورت میں معاوضہ وصول کریں، ''قصاص اور دیت'' کے قانون کے تحت قتل یا دیگر جسمانی نقصان پہنچانے کی صورت میں مجرم سے قصاص یا دیت لی جا سکتی ہے۔مذہبی اقلیتیں دعویٰ کرتی ہیں کہ مجرم کے اقلیتی گروہ سے تعلق رکھنے کی صورت میں دیت کی رقم بہت زیادہ جبکہ مقتول کے اقلیتی گروہ میں ہونے کی صورت میں یہ رقم کم رکھی جاتی ہے۔

شریعت کی حدود جن جرائم پر عائد ہوتی ہیں ان میں چوری، مجرمانہ تعلقات، شراب نوشی اور ارتداد شامل ہیں، ملک میں رائج حدود آرڈیننس شہادتوں کے معیار اور سزاؤں کے حوالے سے قرآن مجید میں درج سخت ترین سزاؤں اور ہدایات پر تکیہ کرتا ہے اور ان کا اطلاق مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں پر ہوتا ہے۔اگر قرآن کی تعلیمات کو پیش نظر رکھا جائے تو مسلمان اور غیر مسلم اور مردوں اور عورتوں کی شہادتوں کا معیار الگ الگ ہوتا ہے۔پروٹیکشن آف وومن ایکٹ (فوجداری قوانین میں ترمیم مجریہ 2006ء) کے منظور ہونے تک زنا اور مجرمانہ تعلقات کے مقدمات کی سماعت حدود آرڈیننس کے تحت کی جاتی تھی۔جس کی وجہ سے خواتین کو بہت زیادہ مصائب کا سامنا تھا۔2006ء کے قانون کے تحت یہ مقدمات شرعی عدالتوں سے عام عدالتوں کو منتقل کئے جا چکے ہیں۔اب تک ہزاروں خواتین کو جیلوں سے رہا کیا جا چکا ہے یہ اور بات ہے کہ بعض مقدمات میں سماجی بائیکاٹ کا سلسلہ جاری ہے۔

حکومت نے پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ شامل کر رکھا ہے۔اسی طرح سے قومی شناختی کارڈ اور دیگر درخواستوں میں مذہبی معلومات درج کرنا ضروری ہیں، ووٹ ڈالنے کے لئے تمام شہریوں کے پاس قومی شناختی کارڈ ہونا لازمی ہے۔جو لوگ مسلمان کے طور پر اپنا اندراج کرانا چاہتے ہیں ان کیلئے لازم ہے کہ وہ تحریری طور پر اس بات کا اقرار کریں کہ وہ حضرت محمد ﷺ کو خاتم النبین تسلیم کرتے ہیں اور وہ جماعت احمدیہ

کے بانی کو جھوٹا نبی اور اس کے پیروکاروں کو کافر سمجھتے ہیں۔ اس شرط کو احمدیوں کی شناخت کیلئے لازم کیا گیا ہے۔ نتیجتاً احمدی انتخاب کا بائیکاٹ کرتے ہیں۔

آئین میں ''مذہبی اداروں کی دیکھ بھال'' کرنے کی آزادی فراہم کی گئی ہے۔ اصولی طور پر حکومت منظم مذہبی گروہوں کو عبادت گاہیں قائم کرنے اور مذہبی تربیت دینے سے نہیں روکتی۔ تاہم عملی اعتبار سے مذہبی اقلیتیں اس حق کے استعمال میں پابندیوں کا سامنا کرتی ہیں ضلعی حکام امن عامہ قائم رکھنے کا جواز دیتے ہوئے غیر مسلموں خاص طور پر احمدیوں اور بہائیوں کو اپنے عبادت خانے تعمیر کرنے کی اجازت دینے سے احتراز کرتے ہیں، ایسے واقعات بھی سامنے آئے ہیں کہ سرکاری حکام یا لینڈ مافیا نے اقلیتوں کی عبادت گاہوں پر قبضے کئے ہیں یا انہیں غیر قانونی طور پر فروخت کیا گیا ہے۔ سرکاری طور پر احمدیوں پر اپنے عبادت خانے تعمیر کرنے پر پابندی نہیں ہے لیکن وہ انہیں مسجد نہیں کہہ سکتے۔ احمدیوں نے بتایا ہے کہ ان کی عبادت گاہوں اور برادری کی زمین پر اکثر مقامی حکومتیں قبضہ کر کے انہیں مسلمانوں کے حوالے کر دیتی ہیں۔ ضلعی حکومتیں اکثر و بیشتر احمدیوں کو کھلے طور پر اجتماعات منعقد کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ اس لئے وہ اپنے اجتماعات اپنی طبقے کے اراکین کے گھروں پر منعقد کرتے ہیں۔ اگر ان اجتماعات کے دوران میں ان کے ہمسائے اطلاع دے دیں کہ وہاں قرآن کی تلاوت کی جارہی ہے تو حکومت ان اجتماعات کو بھی روک دیتی ہے۔

سندھ اور پنجاب میں مقیم سکھ برادری کے نمائندوں نے اطلاع دی ہے کہ متروکہ وقف املاک بورڈ ان کے گردواروں کی زمین غیر قانونی طور پر فروخت کر رہے ہیں۔ اپریل 2010ء میں یہ انکشاف کیا گیا تھا کہ متروکہ وقف املاک بورڈ نے لاہور میں گردوارے کی بہتر 72 ایکڑ اراضی (574 کنال) ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کو منتقل کر دی ہے۔ سکھ برادری کے احتجاج کے باوجود متروکہ وقف املاک بورڈ گردواروں کی زمین فروخت کرنے کے اپنے منصوبے پر عمل کر رہا ہے جبکہ 1925ء کے سکھ ایکٹ کے تحت اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسی طرح سے سندھ میں عیسائی راہنماؤں نے کراچی کا سینٹ اینڈریوز چرچ فروخت کرنے کے تجویز کی مخالفت کی ہے۔

حکومت مساجد کی تعمیر و مرمت اور اسلام کے علماء کے لئے رقوم فراہم کرتی ہے۔ وفاقی اور صوبائی حکومتیں 1947ء میں پاکستان اور بھارت کے قیام کے وقت اقلیتوں کی طرف سے چھوڑی جانے والی جائیدادوں کی دیکھ بھال کرنے کی قانوناً پابند ہیں۔ اقلیتی گروہوں کا دعویٰ ہے کہ حکومت ان جائیدادوں کی دیکھ بھال اور حفاظت پر خاطر خواہ رقوم خرچ نہیں کرتی۔ حکومت تمام سنی مسلمانوں سے سالانہ ڈھائی فیصد کی شرح سے زکوٰۃ وصول کرتی ہے اور یہ رقم سنی مسلک کی مساجد، مدارس اور فلاحی کاموں پر صرف کی جاتی ہے۔ حکومت نے دیگر مذہبی گروہوں پر ایسی کوئی قدغن نہیں لگا رکھی۔

حکومتی پالیسیاں اکثریتی اور اقلیتی مذہبی گروہوں کے اراکین کو یکساں تحفظ فراہم نہیں کرتیں، مذہبی اقلیتوں کو قانونی طور پر اپنے بعض مذہبی شعائر سرعام لانے کی اجازت نہیں ہے۔ اور امتیازی قوانین اور سماجی دباؤ کی وجہ سے وہ اپنے مذہبی عقائد کے بارے میں کھل کر بات کرنے سے گھبراتے ہیں، 2008ء میں وزارت اقلیتی اُمور کے قیام کے بعد سے مذہبی اقلیتوں کے تحفظ کی ذمہ داری وزارت مذہبی اُمور سے لے لی گئی ہے۔ وزارت اقلیتی اُمور کابینہ کی سطح کی مکمل وزارت ہے، جس کا مقصد 1973ء کے آئین کے تحت اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرنا ہے ایک رومن کیتھولک شہباز بھٹی اس وزارت کے نگران ہیں۔ وزارت اقلیتی اُمور کے بجٹ میں مقامی اقلیتوں کی امداد، اقلیتوں کے عبادت خانوں کی مرمت، اقلیتوں کے زیرِ انتظام چلنے والے چھوٹے ترقیاتی منصوبوں اور اقلیتوں کے مذہبی تہواروں کو منانے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس سے

پہلے یہ تمام اخراجات وزارت مذہبی اُمور کے ذمہ تھے۔ مذہبی اقلیتوں کا دعویٰ ہے کہ وزارت اقلیتی اُمور کو خاطر خواہ رقم فراہم نہیں کی جاتی اور ایسے دیہات اور آبادیاں، جہاں اقلیتیں رہائش پذیر ہیں، بنیادی شہری سہولیات سے محروم ہیں۔

وزارت مذہبی اُمور، زکوٰۃ وعشر بنیادی طور پر حج اور دیگر اسلامی عبادات کیلئے جانے والے عازمین کے لئے انتظامات کرتی ہے تاہم وفاقی حکومت توہین رسالت اور تعلیمی اصلاحات سے متعلق اُمور میں اس وزارت سے مشورہ کرتی ہے۔ یہ وزارت امن اور مذہبی رواداری کے فروغ کے لئے مختلف تقریبات کا اہتمام کرتی ہے اور ان موضوعات پر تحقیق بھی کراتی ہے۔ جون 2010ء میں صوفی مشاورتی کونسل کی قومی صوفی کونسل کے طور پر تشکیل نو کی گئی، جس کا مقصد صوفی مکتبہ فکر کے مراکز قائم کرنا، مسلمان صوفیاء کی تعلیمات کے بارے میں تحقیق کرانا اور مذہبی سوچ وفکر کو آزادی دینا ہے۔

حکومت اسلامی تہواروں اور ایام پر سرکاری تعطیل کرتی ہے۔

حکومت اعلیٰ ترین سطح پر مذاہب کے مابین گفت وشنید اور تحمل برداشت، روشن خیالی اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ پر زور دیتی رہی ہے۔

آئین میں ''مذہبی تعلیم فراہم کرنے والے اداروں'' کو تحفظ دیا گیا ہے۔ کس بھی طالب علم کو اس کی مرضی کے خلاف نہ تو مذہبی تعلیم و تربیت دی جاسکتی ہے اور نہ ہی اس سے عبادت کرائی جاسکتی ہے۔ کسی بھی مذہبی برادری یا اقلیت کے طلبہ کو مذہبی تعلیم سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔

تمام سرکاری اسکولوں میں اسلامیات (اسلامی علوم) کا مضمون مسلمان طلبہ کے لئے لازمی ہے۔ اگرچہ دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے طلبہ قانوناً اسلام کے بارے میں پڑھنے کے پابند نہیں ہیں، لیکن عام طور پر انہیں متبادل کے طور پر اپنے مذہبی عقائد کے مطابق تعلیم نہیں دی جاتی۔ کچھ اسکولوں میں غیر مسلم طالب علم اخلاقیات کا مضمون لے سکتے ہیں۔ کچھ والدین ذاتی خرچ پر اپنے بچوں کو مذہبی اسکولوں میں بھیج سکتے ہیں۔ عام طور پر پرائیویٹ اسکولوں کو مذہبی تعلیم دینے یا نہ دینے کی آزادی حاصل ہے۔ اسلامی گروپوں کے زیرِ اہتمام چلنے والے مدارس اور پرائیویٹ اسکولوں میں فرقہ واریت یا مذہبی نفرت پھیلانے والا مواد پڑھانے کی یا مذہبی وفرقہ وارانہ تشدد کی حوصلہ افزائی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگرچہ بعض اداروں میں ایسا ہوتا ہے۔

آئین میں خاص طور پر مذہب کی بنیاد پر کسی بھی سرکاری تعلیمی ادارے میں داخلہ دینے میں امتیاز برتنے پر پابندی ہے۔ سرکاری حکام کا کہنا ہے کہ سرکاری تعلیمی اداروں میں داخلے پر اثر انداز ہونے والے عوامل میں اُمیدوار کے حاصل کردہ نمبر یا گریڈ یا صوبہ جاتی تعلق شامل ہیں، تاہم اُمیدواروں کو داخلے کے درخواست فارم جمع کراتے وقت اپنے مذہب کے بارے میں لکھنا پڑتا ہے۔ یونیورسٹیوں سمیت نجی تعلیمی اداروں میں بھی مذہب کے بارے میں بتانا لازم ہے۔ جو طلبہ اپنے آپ کو مسلمان کہلانا چاہتے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ لکھ کر دیں کہ وہ حضرت محمد ﷺ کو خاتم النبین تسلیم کرتے ہیں۔ اس طرح سے احمدیوں کی شناخت ہو جاتی ہے۔ غیر مسلموں کو اپنے مذہب کے بارے میں اپنے مقامی مذہبی راہنما سے تصدیق کرانا پڑاتی ہے۔

مسلمان علماء اور مدارس کے زیرِ اہتمام چلنے والے پرائیویٹ اسکولوں کے نصاب اور کردار میں واضح فرق موجود ہیں۔ ان میں بعض اسکول کے وقت کے بعد اسلام کی دینی تعلیم فراہم کرتے ہیں۔ جس کے لئے کوئی ڈگری نہیں دی جاتی۔ دین اسلام کے بارے میں مکمل ڈگری

کورس کا حدود اربعہ ملک کے پانچ مدرسہ بورڈ متعین کرتے ہیں۔ باقاعدہ تعلیم کا مکمل کورس حکومت کے مقرر کردہ میٹرک کے معیار کے مطابق یا برطانوی اے لیول کے نصاب کے مطابق ہوتا ہے جبکہ ووکیشنل ٹریننگ کے سرٹیفکیٹ کورس یا ان سب کورسوں کے ایک ملے جلے انتخاب پر مشتمل ہوتا ہے۔ مدارس میں طلبہ کل وقتی، جز وقتی، مقیم یا ان کے ملے جلے مجموعے کے مطابق پڑھتے ہیں۔ کچھ دیہی طبقات میں تعلیم کا واحد ذریعہ مدارس ہیں۔

حالیہ برسوں میں مدارس کی ایک محدود لیکن بااثر تعداد نے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے دہشت گردی کی حمایت میں انتہا پسندی پر مبنی نظریات کا پرچار اور تعلیم شروع کر رکھی ہے۔ انتہا پسندی کے پھیلاؤ کی روک تھام کے لئے 2002ء میں منظور کئے گئے مدرسہ رجسٹریشن آرڈیننس کی رو سے تمام مدارس پر لازم کیا گیا ہے کہ وہ یا تو پانچ خودمختار وفاق المدارس میں سے کسی ایک کے ساتھ یا براہِ راست حکومت کے ساتھ منسلک ہوں، وہ غیر ملکی امداد لینا بند کر دیں اور غیر ملکی طلبہ کو اسی صورت داخلہ دیں جب ان کی اپنی حکومتوں نے اس کی اجازت دی ہو، وزارتِ مذہبی اُمور کے مطابق جون 2010ء تک انیس ہزار ایک سو چار مدارس رجسٹرڈ ہو چکے تھے۔ ان میں سات سو ستر مدارس صرف ایک سال یعنی 2009ء میں رجسٹرڈ ہوئے تاہم سول سوسائٹی کی کئی تنظیمیں اور ماہرین تعلیم ملک میں چلنے والے مدارس کی تعداد کے بارے میں متضاد آراء کا اظہار کرتے ہیں۔

2005ء میں قواعد وضوابط کا ایک ڈھانچہ تجویز کیا گیا تھا جس کے تحت مدارس کی کوا پریٹیو رجسٹریشن جس میں مالی و تعلیمی تفصیلات موجود ہوں اور مذہبی وفرقہ واریت، تنگ نظری، تشدد اور نفرت پر مبنی تعلیم کی کڑی نگرانی کا نظام قائم کرنا مقصود تھا لیکن سابقہ حکومت میں اختیارات کی جنگ اور سیاسی کشمکش کے باعث یہ ابھی تک زیر التواء ہے۔ حکومت اور مدارس کے خودمختار بورڈز نے تمام مدارس میں ریاضی، انگریزی اور سائنس سمیت دیگر دنیاوی علوم کی کل وقتی تعلیم مرحلہ وار طریقے سے نافذ کرنے پر اتفاق کیا تھا۔ سویلین حکومت مدارس میں اصلاحات کو ایک ترجیح تصور کرتی ہے لیکن اس بارے میں پیش رفت خاصی سست ہے۔ وزارتِ مذہبی اُمور کے حکام کا کہنا ہے کہ مدارس میں اصلاحات کے مقاصد پورے کرنے کی راہ میں رقم کی کمی ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اس وقت حکومت کے پاس ان اصلاحات پر عمل درآمد کرنے کیلئے کوئی رقم موجود نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ گزشتہ تین برسوں کے دوران حکومت کی مدد سے کچھ مدارس میں دنیاوی مضامین متعارف کرائے جا چکے ہیں۔

اگرچہ حکومت مدارس کیلئے ایسا یکساں تعلیمی نصاب مہیا کرنے کا اعلان کر چکی ہے جس میں دنیاوی تعلیم پر زیادہ زور دیا گیا ہو، تاہم ابھی تک اس کی منظوری نہیں دی جا سکی۔ دیوبندی مدرسہ بورڈ وفاقی المدارس العربیہ کے سیکرٹری جنرل مولانا محمد حنیف جالندھری نے اپریل 2009ء میں اس پالیسی کی مخالفت کرتے ہوئے بیان دیا تھا کہ پانچوں مکاتب فکر کے بورڈوں کے مشورے اور منظوری کے بغیر مدارس کے نصاب میں حکومت کی طرف سے کسی قسم کی مداخلت یا تبدیلی برداشت نہیں کی جائے گی۔

تمام وفاق المدارس مدرسوں میں مذہبی یا فرقہ وارانہ تنگ نظری یا عدم برداشت کی تعلیم کے خاتمے اور دہشت گردوں یا انتہا پسندوں کی طرف سے بھرتی کے عمل کو روکنے کے ذمہ دار ہیں۔ تمام وفاق المدارس کے مقرر کردہ انسپکٹر اس امر کو یقینی بنانے کے پابند ہیں کہ تمام متعلقہ مدارس، جن میں طلبہ کو کل وقتی دینی تعلیم دی جاتی ہو، اپنے ہاں دنیاوی مضامین بھی متعارف کرائیں۔ تمام وفاق المدارس اس بات کے بھی پابند ہیں کہ وہ مدرسوں کو بیرون ممالک سے نجی طور پر رقوم کی فراہمی نہ ہونے دیں۔ نسبتاً کم تعداد میں، لیکن پھر بھی کچھ بااثر غیر رجسٹرڈ اور دیوبندی

مدارس، انتہاپسندی کی تعلیم دینے یا اپنے طلبہ کو انتہا پسند تنظیموں میں شامل ہونے کی اجازت دینے میں مصروف ہیں۔ اسی طرح سے کالعدم لشکر طیبہ کے خیراتی ادارے جماعت الدعوہ کے زیرِ اہتمام چلنے والے دعوہ اسکولوں میں بھی اسی طرح کی تعلیم دینے اور لشکر طیبہ کیلئے بھرتی کئے جانے کا پتہ چلا ہے۔ یہ ایک غیر ملکی دہشت گرد تنظیم تصور کی جاتی ہے۔ نومبر 2008ء میں بھارت کے شہر ممبئی میں ہونے والے دہشتگرد حملے میں لشکر طیبہ کے ملوث ہونے کی خبروں کے بعد پنجاب کی صوبائی حکومت نے جماعت الدعوۃ کے کئی اداروں کا انتظام سنبھال لیا تھا۔

عوامی نیشنل پارٹی (اے این پی) کی قیادت میں خیبر پختونخوا کی حکومت نے وادیٔ سوات میں طالبان کی شورش کو ختم کرنے کی ایک کوشش کے طور پر فروری 2009ء میں انتہا پسند تنظیم تحریک نفاذ شریعت محمدی (ٹی این ایس ایم) کے ساتھ امن معاہدہ کیا تھا جس کی رو سے خیبر پختونخوا کے مالاکنڈ ڈویژن میں نظام عدل ریگولیشنز (این اے آر) نافذ کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اپریل 2009ء میں صدر آصف علی زرداری نے نظام عدل ریگولیشنز پر دستخط کر دیئے اور یہ نافذ ہو گیا۔ 1994ء اور 1998ء میں شریعت کے نفاذ (مقامی طور پر اسے فوری انصاف کے مترادف سمجھا جاتا ہے) کی کوششوں کی بنیاد پر متعارف کرائے جانے والے نظام عدل ریگولیشنز میں فوجداری اور دیوانی مقدمات کا فیصلہ کرنے کی مدت کا تعین کیا گیا۔ مملکت کی طرف سے قاضی (اسلامی جج) مقرر کرنے اور مقامی اپیلوں کی سماعت کیلئے ایک عدالت قائم کرنے کی صراحت بھی این اے آر میں کی گئی تھی، جس کیلئے ججوں کا انتخاب پشاور ہائیکورٹ نے کرنا تھا۔ سول سوسائٹی بالعموم اور مذہبی اقلیتی گروہ بالخصوص سوات میں دینی تعلیمات کی بنیاد پر ایک متوازی نظام انصاف قائم کرنے پر تحفظات کا اظہار کر رہے ہیں، نظام عدل ریگولیشنز کا دفاع کرنے والوں کا کہنا ہے کہ آئین کے تحت تمام قوانین کا اسلام کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ یوں نظام عدل ریگولیشنز کوئی نیا قانون نہیں ہے۔ یہ معاہدہ اس توقع کے ساتھ کیا گیا تھا کہ مقامی جنگجو نظام عدل ریگولیشنز کے ذریعے شریعت کے نفاذ کے بعد ہتھیار ڈال دیں گے۔ تاہم صدر کی طرف سے این اے آر پر دستخط کئے جانے کے بعد جنگجوؤں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا اور اپنی گشت کا دائرہ مالاکنڈ ڈویژن کے ایک اور ضلع بونیر تک بڑھا دیا۔ جنگجوؤں کی طرف سے پرتشدد کاروائیوں کے بڑھتے ہوئے واقعات کے پیش نظر فوج نے 26 اپریل 2009ء آپریشن شروع کیا جس کے نتیجے میں تقسیم کے بعد پاکستان کی تاریخ کی سب سے بڑی شہری آبادی کی نقل مکانی دیکھنے میں آئی۔ طالبان کے زیرِ اثر زیادہ تر علاقوں سے ان کا صفایا کر دیا گیا۔ اپریل 2009ء میں فوجی آپریشن کے آغاز سے این اے آر پر عمل درآمد رکا ہوا ہے۔ زیرِ نظر رپورٹ کی تدوین کے اختتام تک صوبہ خیبر پختونخوا اور فاٹا میں فوجی آپریشن جاری ہے۔

اگرچہ حکومت کی طرف سے مذہب کے بارے میں مواد کی اشاعت پر عمومی پابندی نہیں ہے تاہم احمدیوں کے مذہبی لٹریچر کی فروخت پر پابندی ہے۔ قانون کی رو سے اسلام یا پیغمبروں پر تنقید یا کسی اور مذہب کے عقائد کی توہین پر مبنی مواد کی اشاعت نہیں کی جا سکتی۔

حکومت کی طرف سے والدین کو اپنے بچوں کو اپنے مذہبی عقائد اور تعلیمات کے مطابق پروان چڑھانے پر کوئی پابندی، قدغن یا سزا نہیں ہے۔ نہ ہی حکومت والدین کو اپنے گھر کی چار دیواری میں اپنے بچوں کو دینی تعلیمات دینے سے روکتی ہے۔

قانون کی رو سے کسی فرد پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ بہرصورت کسی نہ کسی مذہبی گروہ کے ساتھ منسلک ہو تاہم آئین کے مطابق صدر اور وزیراعظم کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ تمام اعلیٰ افسروں اور اراکین پارلیمنٹ کو یہ حلف اُٹھانا پڑتا ہے کہ وہ ملک کی اسلامی شناخت کا تحفظ کریں گے۔ سرکاری ملازمین کو اپنے مذہبی عقائد کے مطابق عبادت کرنے یا اپنے مذہبی شعائر ظاہر کرنے کی مکمل آزادی حاصل ہے۔

احمدیوں کے علاوہ مبلغوں کو ملک میں آنے اور اپنے مذہب کا پرچار کرنے کی اجازت ہے تاوقتیکہ وہ اسلام کے خلاف تبلیغ نہ کریں۔ مشنریوں پر لازم ہے کہ وہ یہ تسلیم کریں کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔ مشنریوں کے لئے ضروری ہے کہ ان کے پاس دو سے پانچ برس کا ویزا ہو اور وہ سال میں ایک مرتبہ ملک کے اندر آ سکتے ہیں۔ مشنریوں کی حیثیت سے ملک چھوڑنے والوں کی جگہ لینے والوں کے لئے متبادل کے طور پر ویزے دستیاب ہیں۔ ویزوں کے اجراء میں طویل تاخیر اور افسر شاہی کی طرف سے پیدا کردہ مسائل عام ہیں۔

انسداد دہشت گردی ایکٹ کے تحت حکومت نے کئی مذہبی انتہا پسند اور دہشت گرد گروپوں کے کام کرنے یا اُن کی رکنیت حاصل کرنے پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔ اس ایکٹ کی رو سے حکومت دہشت گردی کی کارروائیوں، مذہبی نفرت کو مہمیز دینے والے اقدامات یا تقاریر کرنے اور مملکت کے خلاف جرائم کرنے جیسے جرائم پر مقدمات چلانے کے لئے خصوصی عدالتوں کا سہارا لے سکتی ہے۔ تاہم کئی کالعدم گروپ بدستور فعال ہیں۔

حکومت سول یا عام قانون کے تحت کی گئی شادیوں کو تسلیم نہیں کرتی۔ ہر شخص اپنے مذہبی عقائد کے مطابق شادی کر کے اسے رجسٹر کرا سکتا ہے۔ غیر مسلم مردوں کے اسلام قبول کرنے کی صورت میں ان کے نکاح برقرار رہتے ہیں۔ اگر کوئی غیر مسلم عورت اسلام قبول کر لے اور اس کی شادی اس کے سابقہ مذہب کے مطابق ہو چکی ہو تو اسے منسوخ تصور کیا جاتا ہے۔ اسلام قبول کرنے والی کسی ہندو یا عیسائی خاتون کے بچے اس وقت تک ناجائز تصور کئے جاتے ہیں جب تک ان کے شوہر اسلام قبول نہیں کر لیتے۔ شادی کو جائز قرار دینے اور بچوں کو وراثت کے حصول کا اہل ہونے کی ایک ہی صورت ہے کہ شوہر اسلام قبول کر لے۔ کسی مسلمان مرد اور مسلمان عورت کے کسی اور مذہب کو قبول کرنے کی صورت میں ان کے بچے ناجائز تصور کئے جاتے ہیں اور حکومت ان کے بچوں کو اپنی تحویل میں لے سکتی ہے۔ ہندو اور سکھ شادیوں کی رجسٹریشن ان دونوں گروہوں کا دیرینہ مطالبہ ہے۔ مئی 2009ء میں شیڈول کاسٹ رائٹس موومنٹ (ایس سی آر ایم) نے اسلام آباد میں ایک سیمینار کے دوران ہندوؤں کی شادیوں کی رجسٹریشن کرنے کے لئے قانون سازی کرنے کا مطالبہ کیا۔ ان اقلیتوں کے نمائندوں کا کہنا تھا کہ ہندو اور سکھ شادیوں کی رجسٹریشن کے قانون عدم موجودگی کے باعث خواتین کو اپنے والدین اور شوہروں کی جائیداد میں وراثتی حصہ لینے، صحت عامہ کی سہولیات سے مستفید ہونے، ووٹ ڈالنے، پاسپورٹ حاصل کرنے اور جائیداد کی خرید و فروخت کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

حکومت کسی مذہبی عقیدے، تعلیمات یا تشریح کے مطابق کسی مذہبی گروہ کی طرف سے سیاسی جماعتوں کی تشکیل پر پابندی عائد نہیں کرتی۔ حکومت بہت سی اسلامی پارٹیوں اور ان سے منسلک علماء کی سرگرمیوں پر نظر رکھتی ہے کیونکہ وہ پہلے سے دہشت گرد اور انتہا پسند تنظیموں کے ساتھ روابط رکھے ہوئے ہیں۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں مذہبی اقلیتوں کے لئے نشستیں مختص ہیں، یہ نشستیں اسمبلی میں نمائندگی رکھنے والی پارٹیوں میں انہیں مجموعی طور پر حاصل نمائندگی کی بنیاد پر تقسیم کی جاتی ہیں۔ قومی اسمبلی میں مذہبی اقلیتوں کیلئے تیرہ نشستیں مختص ہیں ان میں دس نشستیں اقلیتوں کیلئے اور تین ان کی خواتین کے لئے مختص ہیں۔ اٹھارویں ترمیم کی رو سے اب سینٹ میں مذہبی اقلیتوں کیلئے چار نشستیں ہیں۔ یعنی ہر صوبے سے ایک، صوبائی اسمبلیوں میں بھی اقلیتوں کیلئے نشستیں مختص ہیں۔ خیبر پختونخوا میں تین پنجاب میں آٹھ، سندھ میں نو اور بلوچستان میں تین نشستیں اقلیتوں کیلئے ہیں۔ صوبائی لوکل گورنمنٹ آرڈیننسوں کی رو سے ہر یونین کونسل، تحصیل اور ضلع کی مقامی حکومتوں میں بھی اقلیتوں کے لئے کم سے کم ایک ایک نشست مخصوص ہے۔ 2010ء میں بلوچستان نے لوکل گورنمنٹ ایکٹ پاس کیا۔ جس کی زبان کی رو سے مذہبی اقلیتوں کی نمائندگی آبادی کی بنیاد کم سے کم دو نشستوں پر مشتمل ہوگی۔

مذہبی آزادی پر قدغنیں:

حکومت عام طور پر مذہبی آزادی پر مروجہ قانونی پابندیاں عائد رکھتی ہے:

اگرچہ آئین کے تحت اجتماع منعقد کرنے کی آزادی ہے تاہم 1983ء سے احمدیوں پر کوئی کانفرنس یا اجتماع منعقد کرنے پر پابندی ہے۔ انہیں اپنے عقائد کی تبلیغ کی اجازت بھی نہیں، نہ ہی وہ حج یا کسی اور عبادت کیلئے سعودی عرب جا سکتے ہیں۔ احمدیوں کی شائع شدہ کتب وغیرہ کو سرعام فروخت نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم وہ اپنا مذہبی لٹریچر چھاپتے ہیں جو احمدیوں ہی میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

آئین کی رو سے عبادت گاہیں قائم کرنے مذہبی تعلیم و تربیت فراہم کرنے کی آزادی ہے لیکن عملی اعتبار سے یہ حقوق احمدیوں کو حاصل نہیں ہیں۔ سرکاری حکام احمدیوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھتے ہیں اور معلوم ہوا ہے کہ احمدیوں کی کئی عبادت گاہوں کو بند یا ضبط کیا جا چکا ہے۔ کچھ عبادت گاہوں کی تعمیر یا تو روک دی گئی ہے یا ان کی بے حرمتی کی گئی ہے۔

عام طور پر عدالتیں عوامی دباؤ کے پیشِ نظر اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ سے قاصر رہتی ہیں اور ججوں کو سنی عقائد کیخلاف کسی بھی تصوراتی حملے کی صورت میں سخت اقدامات اُٹھانے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ مذہبی اقلیتوں کے خلاف امتیازی الزامات کم ہی عدلیہ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، کئی غیر سرکاری تنظیموں کے مطابق زیرِ نظر رپورٹ کے عرصے کے دوران میں عیسائیوں اور احمدیوں کے خلاف مقدمات کی تعداد میں مسلسل اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ نچلی عدالتوں کو اکثر و بیشتر دھونس اور دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ انتہا پسند عناصر کے خوف سے فیصلے سنانے میں تاخیر اور ضمانت کی درخواستوں کا مسترد کیا جانا معمول بن چکا ہے۔ توہین رسالت کے مقدمات کی سماعت کرنے والی عدالتیں عام طور پر ضمانت کی درخواستیں مسترد کر دیتی ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ مدعا علیہان سزائے موت کے خوف سے فرار ہو جائیں گے، ملک میں چلنے والے مقدمات کی اکثریت کی طرح بہت سے مدعا علیہان ضمانت کی درخواستوں کی منسوخی کے خلاف اپیل بھی کرتے ہیں لیکن عام طور پر مقدمے کے آغاز میں ضمانت منظور نہیں کی جاتی۔

ضلعی حکومتوں کی طرف سے بعض مذہبی شعائر کی تقسیم یا ان کی نمائش پر کسی پابندی کی کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔ عیسائیوں کی آبادیوں میں ان کے مذہبی شعائر کھلے عام رکھے اور فروخت کئے جاتے ہیں۔ غیر ملکی کتابوں کو دوبارہ چھاپے جانے سے پہلے لازمی طور پر حکومت کے سنسر سے گزرنا پڑتا ہے۔ کتابیں اور رسالے درآمد کرنے کی کھلی آزادی ہے لیکن قابل اعتراض جنسی یا مذہبی مواد سنسر کیا جانا لازمی ہے۔ مذہبی اقلیتوں کی مقدس کتابیں درآمد کرنے کی کھلی آزادی ہے، لیکن اس میں احمدی اس اجازت سے مستثنیٰ ہیں۔ ہندوؤں کو بھارت سے اپنی کتابیں درآمد کرنے میں کچھ مشکلات کا سامنا ہے۔ دیگر گروہوں کو اپنے مذاہب کے بارے میں مواد کے حصول میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تاہم ہو سکتا ہے کہ بعض کتب کی دستیابی صرف کتابوں کی مخصوص دکانوں یا مذہبی مراکز سے ہی ممکن ہو۔

حکمران جماعت یا حزب اختلاف کی معتدل پارٹیوں کے رُکن بننے کیلئے کسی مخصوص مذہبی عقیدے سے منسلک ہونا لازمی نہیں ہے۔ مذہبی جماعتوں سمیت تمام سیاسی پارٹیاں اپنا اپنا اقلیتی شعبہ رکھتی ہیں۔ 2008ء کے عام انتخابات کے بعد بعض مذہبی جماعتوں نے صوبائی اسمبلیوں میں مذہبی اقلیتوں کو بھی نشستیں دی ہیں۔

بعض صورت میں حکومت حج کیلئے رقوم اور سہولیات فراہم کرتی ہے لیکن کسی دوسری مذہبی اقلیت کے عازمین کیلئے ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ پاسپورٹ میں مذہب کے اندراج کے خانے کی موجودگی اور احمدیوں کے نبی کو جھوٹا قرار دینے کی پابندی کی وجہ سے احمدی اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہلا سکتے، اور یوں وہ حج پر بھی نہیں جا سکتے۔ چونکہ حکومت اسرائیل کو تسلیم نہیں کرتی اس لئے کسی بھی مذہبی گروہ کے لوگ اپنے مذہبی عقائد سے قطع نظر اسرائیل کا سفر کرنے سے قاصر ہیں، اس سے بہائی خاص طور پر متاثر ہو رہے ہیں کیونکہ بہائیوں کا روحانی اور انتظامی مرکز بہائی عالمی مرکز شمالی اسرائیل میں واقع ہے۔

اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلے کے حوالے سے ہندوؤں، سکھوں اور احمدیوں کو امتیازی سلوک کا سامنا ہے۔ عیسائیوں کو یونیورسٹیوں اور میڈیکل کالجوں میں داخلہ لینے کے لئے کسی امتیاز کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ شیعہ راہنماؤں نے کبھی یہ اطلاع نہیں دی کہ انہیں کسی اعلیٰ تعلیمی ادارے میں داخلہ لینے یا اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کے حصول میں کسی دشواری کا سامنا ہوا ہے۔ سکھ راہنماؤں نے بتایا ہے کہ چونکہ انہیں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے کالج یا یونیورسٹی کی سطح پر داخلہ لینے کے لئے مستر وکہ وقف املاک بورڈ سے اس امر کی اجازت لینا پڑتی ہے، اور اس میں بہت تاخیر ہو جاتی ہے، لہٰذا اس پابندی کی وجہ سے ان کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔

سرکاری ملازمتوں میں تمام اقلیتی گروہوں کی ترقی کے مواقع محدود نظر آتے ہیں۔ احمدیوں کے لئے خاص طور پر اس طرح کے مسائل عام ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک ''غیر مرئی'' رکاوٹ اعلیٰ عہدوں پر ان کی ترقی کی راہ میں حائل ہے اور بعض سرکاری ادارے اعلیٰ تعلیمی قابلیت ہونے کے باوجود احمدیوں کو ملازمت دینے سے احتراز کرتے ہیں، سرکاری کالجوں میں اسلامیات پڑھانے کے لئے اساتذہ کے انتخاب، سرکاری مساجد اور فوج کے لئے اماموں کے چناؤ میں حکومت اہل حدیث اور بریلوی مکتبہ فکر کے حامل افراد کے ساتھ امتیاز برتتی ہے۔

مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی کم تعداد فوجی ملازمتوں کے لئے رجوع کرتی ہے۔ سرکاری طور پر ان کی ترقی میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں، تاہم عملی اعتبار سے غیر مسلم فوجی افسر کرنل کے عہدے سے آگے نہیں جا پاتے اور انہیں سیاسی اعتبار سے حساس عہدوں پر کبھی تعینات نہیں کیا جاتا۔ مسلمان فوجیوں کے لئے اماموں کی سہولت موجود ہے لیکن مذہبی اقلیتی گروہوں سے تعلق رکھنے والے فوجی اس سہولت سے محروم ہیں۔

سرکاری سکولوں کے نصاب کی کتب میں مذہبی اقلیتوں خاص طور پر احمدیوں، ہندوؤں اور یہودیوں کے بارے میں تحقیر آمیز مواد موجود ہے۔ مذہبی عدم برداشت کی تعلیم عام ہے، حکومت اس طرح کی تعلیمات ختم کرنے کے لئے نصاب پر نظر ثانی اور دنیاوی مضامین میں سے اسلام کا ضرورت سے زائد ذکر ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

جو مذہبی گروہ زمین خریدنے یا اپنی عبادت گاہیں تعمیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں سرکاری حکام کی طرف سے غیر ضروری تاخیر اور رشوت طلب کرنے جیسی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگرچہ احمدیوں کو اکثر و بیشتر اپنی عبادت گاہیں تعمیر کرنے سے روک دیا جاتا ہے لیکن سنی

مسلمان حکومت کی اجازت کے بغیر مزار اور مسجدیں تعمیر کرتے ہیں۔ بعض اوقات تو وہ ایسا کرتے ہوئے سرکاری زمینوں کو بھی زیرِ تصرف لے آتے ہیں اور زمین کے استعمال کے بارے میں آرڈیننس کی پرواہ بھی نہیں کرتے۔

مذہبی آزادی کے حوالے سے زیادتیاں:

اطلاعات کے مطابق مذہبی الزامات کی بنیاد پر گرفتار افراد کو پولیس کی طرف سے تشدد اور بدسلوکی کا نشانہ بننا پڑتا ہے اور توہین رسالت کے ایک مقدمہ میں تو پولیس کو ماورائے عدالت قتل کا موردالزام ٹھہرایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر 16 ستمبر 2009ء کو ایک عیسائی نوجوان رابرٹ فانش پولیس کی حراست میں ہلاک ہوگیا۔ اس پر توہین رسالت کا الزام تھا۔ اس واقعہ نے ذرائع ابلاغ کی بھرپور توجہ حاصل کی اور انسانی حقوق کے کئی گروپوں نے اسے ماورائے عدالت قتل قرار دیا۔ عیسائیوں اور احمدیوں کا دعویٰ ہے کہ انہیں عام طور پر زیادتیوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ غیر مسلم قیدیوں کو بھی جیلوں میں مسلمان قیدیوں کے مقابلے میں کم سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔

نیشنل کمیشن فار جسٹس اینڈ پیس (این سی جے پی) کے مطابق 2009ء میں توہین رسالت کے قوانین کے تحت ایک سو بارہ مقدمات درج ہوئے۔ ان ایک سو بارہ افراد میں سے ستاون احمدی، سینتالیس مسلمان اور آٹھ عیسائی تھے۔ 1987ء سے لے کر 2009ء تک ایک ہزار بتیس افراد کو توہین رسالت کے قوانین کے تحت مقدمات میں ماخوذ کیا جا چکا ہے۔

احمدیوں کے راہنماؤں کا دعویٰ ہے کہ حکومت تعزیرات کی مختلف شقیں مذہبی وجوہات کی بنیاد پر ان کے ہم مذہب لوگوں کے خلاف استعمال کرتی ہے۔ حکومت احمدیوں کو ہراساں کرنے اور نشانہ بنانے کے لئے احمدی مخالفانہ قوانین کا سہارا لیتی ہے۔ جو لوگ احمدی ہو جائیں انہیں توہینِ رسالت، احمدیوں کے حوالے سے بننے والے قوانین کی خلاف ورزی اور دیگر جرائم کا مرتکب ٹھہرایا جاتا ہے۔ احمدیوں کو بلاواسطہ یا بالواسطہ اپنے آپ کو مسلمان کہلوانے سے روکنے والے قانون کی مبہم زبان کی وجہ سے حکام کو موقعہ مل جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی طرح سلام کرنے یا اپنے بچّوں کے نام ''محمد'' رکھنے پر احمدیوں پر مقدمات قائم کریں۔ ربوہ میں قائم جماعت احمدیہ کے مطابق جون 2010ء تک بیالیس احمدیوں کو ان کے حوالے سے بننے والے قوانین یا توہین رسالت کے قوانین کے مقدمات کا سامنا تھا جبکہ پچیس احمدیوں کو تعزیرات کی مختلف شِقوں کے تحت مقدمات میں ماخوذ کیا گیا تھا۔

احمدی رہنماؤں کے مطابق زیرِ نظر رپورٹ کی تیاری کے اختتام تک چھ احمدی جیل میں تھے، اِن میں ایک کو عمر قید کی سزا سنائی گئی ہے، تین کو سزائے موت کا سامنا ہے اور دو کو تبلیغ کے جُرم میں قید کیا گیا ہے۔ احمدی کمیونٹی کا دعویٰ ہے کہ یہ گرفتاریاں بلا جواز کی گئی تھیں اور ان کی وجہ صرف گرفتار شدگان کے مذہبی عقائد ہیں۔ زیرِ نظر رپورٹ کی تیاری کے کے عرصے میں احمدیہ کمیونٹی کے سرکردہ افراد کے خلاف قتل اور جائیداد کو تباہ کرنے سمیت کئی جرائم کے مقدمات قائم کئے گئے ہیں۔ یہ مقدمات ابھی زیرِ سماعت نہیں آئے اور ملزمان کو ضمانت پر رہنے کی اجازت دی جا چکی ہے۔

عام طور پر سرکاری حکام کاروباری تنازعات اور ذاتی دشمنیوں کی بنیاد پر توہینِ رسالت کے قوانین کو مذہبی اقلیتوں اور مجبور و مقہور مسلمانوں کو ہراساں کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ مختلف افراد کو جھوٹے الزامات کے تحت گرفتار کرنا اور سزا دلوانا سرکاری حکام کا معمول

ہے۔جج اور مجسٹریٹ انتہا پسندوں کے غیض وغضب اوران کی ہنگامہ آرائی سے بچنے کے ئے اکثر مقدمات کوطول دیتے رہتے ہیں۔

حکومت مذہبی عقائد کی بنیاد پر لوگوں سے جبری مشقت کرانے یا انہیں غلام بنانے کی اجازت نہیں دیتی لیکن اقلیتی گروپوں کے رہنماؤں کا الزام ہے کہ حکومت اینٹوں کے بھٹوں اور زراعت کے شعبے میں روا رکھی جانے والی جبری مشقت کی خاطر خواہ روک تھام کرنے میں ناکام رہی ہے۔اس غیر قانونی کام کا زیادہ تر نشانہ ہندو اور عیسائی مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ بنتے ہیں۔

فاٹا اور مالاکنڈ ڈویژن میں مذہبی اقلیتوں کے خلاف دہشت گردی کی کارروائیوں اور دہشت گردوں کے خلاف شروع کئے جانے والے فوجی آپریشنوں کی وجہ سے ہزاروں لوگوں نے ،بشمول سینکڑوں سکھ خاندانوں کے،متاثرہ علاقوں میں اپنے گھر بار چھوڑ کر ملک کے دوسرے علاقوں میں پناہ لی۔حکومت نے اندرون ملک نقل مکانی کرنے والے مقامی سکھوں کو امداد فراہم کی۔زیرِ نظر رپورٹ کی تیاری کے اختتام تک زیادہ تر لوگ اپنے گھروں کو واپس لوٹ چکے ہیں۔

گزشتہ رپورٹ کے برعکس اب کے سکھوں کی طرف سے جبراً جزیہ (غیر مسلکوں پر عائد کیا جانے والا ٹیکس) ادا کرنے کی کوئی اطلاع نہیں ملی ہے۔

جون2010ء میں دہشت گردوں نے پشاور میں چمکنی کے علاقے میں میاں عمر بابا کے مزار کو دھماکے سے اڑا دیا۔اگرچہ پولیس نے مقدمہ درج کرلیا تھا تاہم اس رپورٹ کی تیاری کے اختتام تک کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی۔5 مارچ2009ء کے بعد سے،یعنی جب معروف پشتو شاعر رحمٰن بابا کے مزار پر حملہ کیا گیا تھا، یہ پشاور میں کسی مزار پر پہلا حملہ تھا۔

نامعلوم دہشت گردوں نے28 مئی2010ء کو لاہور میں احمدیوں کے دو الگ الگ اجتماعات پر حملے کئے۔جمعہ کے روز ہونے والے ان حملوں میں دھماکہ خیز مواد، بم اور خودکار اسلحہ استعمال کیا گیا۔چھیاسی سے زیادہ افراد ہلاک اور ایک سو چوبیس افراد زخمی ہوئے تھے۔پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ شہباز شریف،صدر آصف علی زرداری اور وزیر اعظم گیلانی نے اس حملے کی مذمت کی اور فوری تحقیقات کا حکم دیا۔28 مئی کو ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان (ایچ آر سی پی) نے ایک بیان جاری کیا جس میں حملے کی مذمت کی گئی اور حکومت پر تنقید کی گئی تھی کیونکہ وہ احمدی کمیونٹی کو ملنے والی دہشت گردوں کی دھمکیوں کے پیش نظر ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کرنے میں ناکام رہی تھی۔ایچ آر سی پی نے حکومت پر زور دیا کہ وہ احمدیوں کو فول پروف سیکورٹی فراہم کرے۔

انٹرنیشنل کرسچین چرچ (آئی سی سی) کے مطابق16 مئی2010ء کو کم وبیش چالیس مسلمان جنگجوؤں نے مسلح ہوکر کراچی میں کرسچین ابنڈنٹ لائف چرچ پر حملہ کیا۔مسلح جنگجوؤں نے سیفل مری گوٹھ سرجانی کے علاقے میں واقع چرچ میں موجود عیسائیوں کو قتل کرنے کی دھمکی دی۔جنگجوؤں کے جانے کے بعد پادری نے سرجانی پولیس سے رابطہ کیا تاکہ اسے حملے اور دھمکیوں کے بارے میں مطلع کرسکے۔تاہم پولیس نے عیسائیت سے تائب ہوکر مسلمان ہونے والے ایک شخص طارق محمد کو دھمکیاں دینے کے الزام میں چار عیسائیوں کے خلاف مقدمہ درج کر لیا۔جنگجوؤں کا یہ گروپ طارق محمد کی سرکردگی میں چرچ کو مسمار کرکے اس جگہ پر مسجد بنانا چاہتا ہے۔اس رپورٹ کی تیاری کے عرصے کے اختتام تک یہ چاروں عیسائی روپوشی کی حالت میں زندگی گزار رہے ہیں۔

کمپاس ڈائریکٹ نیوز (سی ڈی این) کے مطابق مئی 2010ء میں پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں پولیس نے غیر قانونی طور پر شراب رکھنے کے جھوٹے الزام میں تین عیسائیوں عاطف مسیح، کامران مسیح اور نوید گل کو گرفتار کیا۔ ان تینوں کے خلاف ان کے آجر رانا اعجاز نے پولیس کو شکایت کی تھی کیونکہ انھوں نے اتوار کے روز کام کرنے سے انکار کیا تھا۔

سی ڈی این کے مطابق مئی 2010ء میں ایک عیسائی ظفر مسیح پنجاب میں اپنا شہر چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوا کیونکہ اس نے ایک اٹھائیس سالہ تاجر علی احمد پر الزام لگایا تھا کہ علی احمد نے 12 مئی کو اس کی بارہ سالہ بیٹی کو مارا پیٹا اور مجرمانہ حملے کا نشانہ بنایا۔ سی ڈی این کا دعویٰ ہے کہ ظفر مسیح نے تتلے عالی پولیس تھانے میں علی احمد کے خلاف ایف آئی آر درج کرانے کی کوشش کی لیکن ایس ایچ او اقبال اوجلہ نے اس کی درخواست منظور کرنے سے انکار کر دیا اور بعد میں مبینہ طور پر اس پر دباؤ ڈالا کہ وہ اپنی درخواست واپس لے لے۔ اس وقت سے ظفر مسیح کو علاقے کے سب سے بڑے زمیندار اور مقامی سیاست دان امتیاز کھرل کی طرف سے دھمکیاں مل رہی ہیں۔ 13 مئی کو امتیاز کھرل نے اپنے گھر پر ایک جرگہ منعقد کیا جس میں ایس ایچ او اقبال اوجلہ، مقامی مسلمان پولیس کے افسر، ظفر مسیح، اس کا خاندان اور شہر میں آباد دیگر عیسائی خاندان بھی موجود تھے۔ مبینہ طور پر امتیاز کھرل نے عیسائیوں کو دو باتوں میں ایک ماننے کا کہا۔ ظفر مسیح اپنے الزامات واپس لے یا تمام عیسائی شہر چھوڑ دیں۔

اسسٹ نیوز سروس کے مطابق 6 مئی 2010ء کو لاہور میں پانچ عیسائی لڑکوں شعیب الیاس، چمن اشرف، اشعر مسیح، نیتا مسیح اور سنی کو اپنے گھر چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ ان پر الزام عائد کیا گیا کہ انہوں نے قرآنی آیات لکھے ہوئے بینر کو پھاڑ کر توہین کا ارتکاب کیا ہے۔ رپورٹ کی تیاری کا عرصہ ختم ہونے تک ان پانچوں لڑکوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

یکم اپریل 2010ء کو نامعلوم دہشت گردوں نے فیصل آباد میں ایک کار میں سوار تین احمدی افراد پر فائرنگ کی جس کے نتیجے میں دو بھائی ساٹھ سالہ شیخ اشرف پرویز اور ستاون سالہ شیخ مسعود جواد اور اُس کا چوبیس سالہ بیٹا آصف مسعود ہلاک ہو گئے۔ اطلاعات کے مطابق ان افراد کو ان کے مذہبی عقائد کی بنیاد پر دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔

سی ڈی این کے مطابق 28 مارچ 2010ء کو پولیس نے سینتالیس عیسائیوں کے خلاف شراب رکھنے کا جھوٹا مقدمہ درج کیا۔ ان افراد میں دو بچے اور آٹھ عورتیں بھی شامل تھیں۔ اس مقدمہ کا مقصد انہیں خوفزدہ کر کے ان سے رقم بٹورنا تھا۔ سی ڈی این نے بتایا ہے کہ پولیس شوکت مسیح اور اس کی بیوی پروین بی بی کے گھر پر چڑھ دوڑی، گھر میں توڑ پھوڑ کی اور پروین بی بی کے ساتھ بدسلوکی کی۔ پولیس نے ان دونوں اور پینتالیس دوسرے عیسائیوں کو رشوت نہ دینے کی صورت میں شراب رکھنے کے جرم میں گرفتار کرنے کی دھمکی دی۔ ان افراد نے رشوت دینے سے انکار کر دیا تھا۔

انٹرنیشنل کرسچین چرچ کے مطابق مارچ 2010ء میں ایک عیسائی قمر ڈیوڈ کو عمر قید اور ایک لاکھ ہزار روپے (تقریباً ایک ہزار ایک سو ستاسی ڈالر) جرمانے کی سزا سنائی گئی، اس پر الزام تھا کہ اُس نے قرآن اور حضرت محمدؐ کے بارے میں گستاخانہ الفاظ کہے ہیں۔

اسسٹ نیوز سروس کے مطابق دو مارچ 2010ء کو ایک عیسائی جوڑے منیر مسیح اور رقیہ بی بی کو قرآنِ مجید پھاڑنے اور اسے گندے ہاتھوں سے چھونے کے جرم میں پچیس سال قید کی سزا سنائی گئی۔

اسسٹ نیوز سروس کے مطابق یکم مارچ 2010ء کو پنجاب کے ضلع گوجرانوالہ میں وانڈو کے گاؤں میں ایک چونتیس سالہ عیسائی عورت گلزار کنول پر ایک دکاندار نے الزام لگایا کہ اُس نے توہین رسالت کی ہے۔ گلزار کنول نے اپنی کاسمیٹکس کی دکان اس دکاندار کو فروخت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس الزام کے بارے میں باتیں جنگل کی آگ کی طرح پھیلیں اور سینکڑوں مقامی مسلمانوں کا ایک جلوس گلزار کنول کی دکان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ یہ لوگ اس کے خلاف نعرے لگا رہے تھے اگرچہ گلزار کنول نے توہین رسالت کا ارتکاب نہیں کیا لیکن اسے بدستور قتل کی دھمکیاں مل رہی ہیں۔

27 فروری 2010ء کو ڈیرہ اسماعیل خان اور فیصل آباد میں عید میلاد النبیؐ کے جلسوں میں جھگڑوں کے باعث سات افراد ہلاک اور چوالیس زخمی ہو گئے۔ یہ پُرتشدد واقعات دیوبندی، اہلِ حدیث اور بریلوی مکاتبِ فکر کے درمیان لڑائی کی وجہ سے رونما ہوئے۔

14 جنوری 2010ء کو حکام نے احمد نگر میں احمدیوں کی ایک عبادت گاہ ضبط کر کے اسے ''امن عامہ برقرار رکھنے'' کے نام پر مسلمانوں کے حوالے کر دیا کیونکہ مسلح مذہبی عناصر اس عبادت گاہ پر زبردستی قبضہ کرنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ ضلعی رابطہ افسر نے اپنے ان اقدامات کے جواب کے طور پر آئین میں احمدیوں کے حوالے سے کی جانے والی ترمیم کا حوالہ دیا۔

جنوری 2010ء میں اورکزئی ایجنسی کی وادی تیراہ میں جنگجوؤں نے تین سکھوں کو اغوا کر لیا اور ان کی رہائی کے لئے تین کروڑ روپے (تقریباً تین لاکھ اکاون ہزار چھ سو ڈالر) تاوان طلب کیا۔ جب ڈیڈ لائن کے مطابق تاوان ادا نہ کیا گیا تو جنگجوؤں نے 21 فروری کو جسپال سنگھ نامی ایک مغوی کو قتل کر دیا بعد میں سیکورٹی فورسز نے دیگر دو مغویوں کو رہا کرا لیا۔

جنوری 2010ء ہی میں ربوہ میں احمدیوں کی ملکیت کچھ زمین ضبط کر کے اسے نیلام عام کے ذریعے فروخت کر دیا گیا۔ نیلام عام کے نوٹس میں یہ بات واضح کر کے لکھی گئی تھی کہ اس جائیداد کے لئے کوئی احمدی یا ان کے رشتہ دار بولی میں حصہ نہیں لے سکتے اور نہ ہی خریدی جانے والی زمین بعد میں احمدیوں کے ہاتھ فروخت کی جا سکے گی۔

27 دسمبر 2009ء کو آزاد جموں و کشمیر کے شہر مظفر آباد میں شیعہ افراد کے ایک جلوس پر خودکش حملہ کیا گیا جس میں آٹھ افراد ہلاک اور اَسّی زخمی ہوئے۔ اس حملے کی ذمہ داری کسی پر نہیں ڈالی گئی۔

ستمبر 2009ء میں لاہور کے گرین ٹاؤن میں پولیس نے احمدی تاجروں کو ہدایت دی کہ وہ مسلمان انتہا پسندوں کے حملوں سے بچنے کیلئے اپنی دکانوں سے قرآنی آیات ہٹا لیں۔ آئین کی رُو سے کسی احمدی کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کے طور پر پیش کرے۔ ان تاجروں کا کہنا تھا کہ یہ آیات کئی برس سے ان کی دکانوں میں لگی ہوئی ہیں۔ سنی تاجروں نے کاروباری رقابت اور حسد کی وجہ سے پولیس کو یہ شکایت کی تھی۔

پاکستان کرسچین پوسٹ کے مطابق 28 اگست 2009ء کو دہشتگردوں نے کوئٹہ، بلوچستان، میں فائرنگ کر کے چھ عیسائیوں کو ہلاک اور سات کو زخمی کر دیا۔

31 جولائی 2009ء اور یکم اگست 2009ء کو پنجاب میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کے قریب گوجرہ اور کوڑیاں کی بستیوں میں مسلمانوں کے ایک ہجوم نے مبینہ طور پر ایک فرقہ وارانہ انتہا پسند کالعدم تنظیم سپاہ صحابہ پاکستان کے اُکسانے پر وہاں آباد عیسائیوں پر حملہ کیا۔ عیسائیوں پر الزام تھا کہ

انہوں نے قرآنِ مجید کی بے حرمتی کی ہے۔اس ہجوم نے آٹھ عیسائیوں کوقتل کیااورایک سوگھروں کوآگ لگادی۔ پولیس اس کارروائی کوروکنے میں بُری طرح ناکام رہی۔قومی اسمبلی نے گوجرہ میں قتل وغارت گری کی مذمت کیلئے متفقہ قرارداد منظور کی۔ پنجاب میں اقلیتی اُمور کے وزیر نے حملے میں شریک افراد کے خلاف مقدمہ درج کرایا۔اس رپورٹ کی تیاری کا عرصہ ختم ہونے تک گوجرہ کے واقعے کے حوالے سے بیالیس افراد کو گرفتار کیا جاچکا تھا،ان میں چونتیس افراد کوضمانت پر رہا کیا جاچکا ہےاورآٹھ افرادٹوبہ ٹیک سنگھ میں زیرِحراست ہیں۔کوڑیاں والے مقدمے میں پولیس اب تک چوّن افراد کوگرفتار کرچکی ہے ان میں تینتالیس افرادضمانت پر رہا ہو چکے ہیں جبکہ گیارہ افرادابھی جیل میں ہیں،صوبائی حکومت نے ان عیسائیوں کے لئے نئے گھر تعمیر کرنے کا ایک پروگرام شروع کیا ہے۔جو اِن حملوں میں اپنے گھروں سے محروم کردیئے گئے تھے۔ اس رپورٹ کی تیاری کا عرصہ ختم ہونے تک مکانوں کی تعمیرنو کا کام جاری تھا۔

30 جون2009ءکو پنجاب میں ضلع قصور میں ہاتھا پائی کا ایک واقعہ مبینہ طور پرتوہین کے واقعے میں بدل گیااورایک ہجوم نے وہاں آبادعیسائیوں پرحملہ کردیا۔اس کے نتیجے میں سات سوافرادکواپنے گھربارچھوڑکر بھاگنا پڑا۔وفاقی وزیر برائے اقلیتی امورشہباز بھٹی نے متاثرہ خاندانوں کومعاوضہ دینے کی پیشکش کی ہے۔ اس رپورٹ کی تیاری کا عرصہ ختم ہونے تک اس بارے میں مزید کسی پیش رفت کی اطلاع نہیں مل سکی۔

23 جون2009ءکوسی ڈی این نے بتایا کہ پولیس نے گوجرانوالہ کے ایک عیسائی شخص ارشدمسیح کوگرفتار کر کے سیالکوٹ میں قید کے دوران اس پرتشدد کیا گیا۔اطلاعات کے مطابق پولیس نے ارشدمسیح کی بے حرمتی اوراس پرتشدداس وجہ سے کیا کہ اس کا والد ایک عیسائی مبلغ تھا۔ اگرچہ سرکاری طور پراسے رہزنی کا ملزم ٹھہرایا گیا تھالیکن بعد میں اس بنیاد پراس کی ضمانت منظور کرلی گئی کہ وہ رہزنوں میں شامل نہیں تھا۔ گرفتاری کے دوران کئے جانے والے تشدد کے باعث اسے علامہ اقبال میموریل ہسپتال بھیجا گیا۔سی ڈی این کے مطابق حکام نے مبینہ طور پر اسے حکم دیا ہے کہ وہ اپنی بے حرمتی اورتشدد کے حوالے سے زبان بندرکھے۔اس رپورٹ کی تیاری کا عرصہ ختم ہونے تک اس مقدمہ کے بارے میں مزیدمعلومات حاصل نہیں ہوسکی تھیں۔

مئی2009ومیں پنجاب کے ضلع چکوال کے ایک مدرسے کے دوطالب علم مبشراحمد نامی ایک احمدی کے گھر میں داخل ہوئے اوراس کا سرقلم کرنے کی کوشش کی۔ہمسایوں نے مداخلت کر کے اس کی جان چھڑائی لیکن وہ شدید زخمی ہو چکا تھا۔ایک طالب علم کوپکڑکر مقامی پولیس تھانے لے جایا گیالیکن دوسرا طالب علم فرار ہوگیا۔ پولیس نے تحقیقات شروع کردی ہےاور دوسرے حملہ آور کی گرفتار کے لئے کوشش کررہی ہے۔اس رپورٹ کی تیاری کا عرصہ ختم ہونے تک مزیدمعلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔

17اپریل2009ءکوحکام نے دوعیسائیوں جیمزمسیح اور بوٹا مسیح کوجیل سے رہا کیا۔ان کونومبر2006ءمیں مبینہ طور پرقرآنِ پاک کو جلانے کے جُرم میں دس سال قید کی سزا سنائی گئی تھی۔

4مارچ2009ءکو پندرہ احمدیوں کے خلاف تعزیرات کی شق C-298 کے تحت مقدمہ درج کیا گیاان پرالزام تھا کہ وہ اپنی عبات گاہ کومسجد قرار دے کروہاں عید کی نماز ادا کررہے تھے۔ان پریہ الزام بھی عائد کیا گیا کہ وہ اپنے آپ کومسلمان بنا کر پیش کررہے تھے۔اطلاعات کے مطابق یہ گرفتاریاں ایک کاروباری تنازعہ کا نتیجہ تھیں۔ان احمدیوں کوضمانت پر رہا کیا جاچکا ہےلیکن مقدمہ ابھی زیرسماعت ہے۔اس رپورٹ کی تیاری کا عرصہ ختم ہونے تک اس مقدمہ کے بارے میں مزیدمعلومات حاصل نہیں ہوسکی ہیں۔

کوٹری سندھ میں جنوری 2009ء میں قتل کئے جانے والے ایک احمدی سعید احمد کے بارے میں بھی اب تک کوئی نئی اطلاع نہیں مل سکی۔ اُس وقت احمدی کمیونٹی کے ایک ترجمان کے دعویٰ کے طابق سعید احمد کو اُس کے مذہبی عقائد کی بنیاد پر قتل کیا گیا تھا۔

جنوری 2009ء میں پولیس نے پنجاب کے علاقے لیّہ میں چار نوعمر احمدی لڑکوں اور ایک مَرد کو توہین کے الزام میں گرفتار کیا۔ بتایا گیا ہے کہ بعض مقامی علماء نے اس واقعے کے بعد گڑبڑ اور بدامنی پھیلانے کی کوشش کی تھی۔ ملزمان کو نومبر 2009ء میں ضمانت پر رہا کیا گیا۔ ان کے مقدمے کی سماعت دسمبر 2009ء میں شروع ہوئی اور اس رپورٹ کی تیاری کا عرصہ ختم ہونے تک جاری تھی۔

جنوری 2009ء میں پولیس نے راولپنڈی میں ہیکٹر علیم کو اپنے موبائل فون سے ایک توہین آمیز تحریری پیغام بھیجنے کے الزام میں گرفتار کیا۔ انسدادِ دہشت گردی کی عدالت نے علیم کا مؤقف سننے کے بعد اسے توہین آمیز پیغام بھیجنے کے الزام سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ لیکن اسے بہرحال شریکِ جرم قرار دیا جا رہا ہے۔ علیم ایک ایسے ادارے کا رکن ہے جو عیسائیوں کے حقوق کیلئے کام کر رہا ہے ایک سرکاری اہلکار نے سی ڈی این کو بتایا کہ مذہبی انتہا پسندوں نے یہ فیصلہ دینے پر جج کو یہ کہہ کر مجبور کیا تھا کہ ''اگر تم نے اسے (علیم) کو رہا کیا تو ہم باہر اس کو قتل کر دیں گے۔'' اس رپورٹ کی تیاری کے اختتام تک معلوم ہوا ہے کہ ہیکٹر علیم کے خلاف توہین والے الزامات حذف کئے جا چکے ہیں لیکن وہ بدستور اسمگلنگ اور دھوکہ دہی کے الزامات میں جیل میں مقید ہے۔

ستمبر 2008ء میں سرکاری حکام نے دس احمدیوں کو تعزیرات کی ان شِقوں کے تحت گرفتار کیا جو احمدیوں کے حوالے سے اس میں شامل کی گئی ہیں۔ 11 اکتوبر 2008ء کو انہی الزامات کے تحت آٹھ مزید احمدیوں کو گرفتار کیا گیا۔ تمام گرفتار شدگان کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا تھا۔

پنجاب کی صوبائی حکومت نے مسلمان دینی رہنماؤں کو احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے والی آئینی ترمیم منظور ہونے کی سالگرہ کے حوالے سے ربوہ میں 7 ستمبر 2008ء کو احمدیوں کے خلاف ایک کانفرنس منعقد کرنے کی اجازت دی۔ کانفرنس کے دوران مقررین متواتر اپنی تقاریر میں بتاتے رہے کہ احمدی کیونکر ''واجب القتل'' ہیں۔

2008ء میں انسدادِ دہشت گردی کی ایک عدالت نے منڈی بہاؤالدین پنجاب میں 2005ء میں احمدیوں کی عبادت گاہ پر حملہ کے پانچ گرفتار شدہ ملزمان کو بَری کر دیا۔ اس حملے میں آٹھ افراد ہلاک اور بیس زخمی ہوئے تھے۔ رپورٹنگ کا عرصہ ختم ہونے تک اس واقعے کے متعلق مزید معلومات نہیں مل سکی تھیں۔

محمد شفیق لطیف، جسے 2008ء سمیت مبینہ طور پر قرآنِ مجید کے نسخہ کو پھاڑنے اور نبی کریمؐ کے خلاف بدزبانی کرنے کے جُرم میں سزائے موت سنائی گئی تھی، کے مقدمے کے بارے میں نئی معلومات نہیں مل سکیں۔ اس رپورٹ کی تیاری کا عرصہ ختم ہونے تک وہ سیالکوٹ پنجاب کی جیل میں مقید تھا۔

احمدیوں کو ضمانت پر رہا کیا جا چکا ہے لیکن مقدمہ ابھی زیرِ سماعت ہے پادری فرینک جان کے مئی 2008ء کے اس مقدمے میں مزید کسی پیش رفت کی کی اطلاع نہیں مل سکی ہے جو اس کے خلاف لاہور پنجاب میں ایک مذہبی کنونشن کے حوالے سے توہینِ رسالت کے الزام میں درج کیا گیا تھا۔

جنوری 2008ء میں ننکانہ صاحب پنجاب کی پولیس نے ایک احمدی تاجر منظور احمد کے خلاف مذہبی کلمات کا حامل ایک کاغذ پھاڑنے پر مقدمہ درج کیا۔ اس رپورٹ کی تیاری کا عرصہ ختم ہونے تک وہ بدستور جیل میں تھا۔

اقلیتی گروپوں کا دعویٰ ہے کہ حکومت مسلمانوں کی طرف سے ان کی جائیدادوں پر قبضہ کرنے کو نظرانداز کرتی ہے اور غیر قانونی کچی آبادیوں کو مسمار کرنے کی پالیسی کے تحت زیادہ تر اقلیتی گروپوں کو ہی نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ان گروپوں نے حکومت پر یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ وہ انتہاپسند گروپوں کی طرف سے اقلیتوں کی عبادت گاہوں پر حملوں کے مقدمات میں دلچسپی نہیں لیتی۔

مذہب کی تبدیلی میں زبردستی:

سماجی دباؤ کے تحت مذہبی اقلیتوں کے افراد کو زبردستی اور دھونس کے ذریعے اسلام قبول کروانے کے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ مذہبی اقلیتوں کا دعویٰ ہے کہ حکومت کی طرف سے اس طرح کے اقدامات کی روک تھام کیلئے خاطرخواہ کارروائی نہیں کی جاتی۔ این سی جے پی کا کہنا ہے کہ عیسائیوں اور ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس نے دسمبر 2009ء میں بتایا کہ اس سال بیس عیسائیوں اور اکیس ہندوؤں کو زبردستی مسلمان کیا گیا ہے۔ ان میں پندرہ مرد، تیرہ عورتیں اور چار بچے شامل ہیں۔ مارچ 2010ء میں ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان نے تخمینہ لگایا کہ ہر ماہ بیس سے پچیس ہندو لڑکیوں کو اغوا کر کے زبردستی مسلمان بنایا جاتا ہے۔

19 مئی 2010ء کو ایک عیسائی لڑکی، جسے تین سال پہلے اغوا کر کے زبردستی مسلمان بنا لیا گیا تھا، دوبارہ اپنے والدین سے آ ملی۔ ٹینا برکت کو، جس کی عمر اب اٹھائیس برس ہے، اس کی ایک سہیلی کے گھر والوں نے اغوا کر لیا تھا۔ پھر اس کے ایک چچا کے ذریعے اس کو مجبور کر کے مسلمان بنایا گیا اور اغوا کنندگان کے خاندان میں اس کی شادی کر دی گئی تھی۔

21 دسمبر 2009ء کو لیاقت پور کے علاقے کچی منڈی سے ایک پندرہ سالہ ہندو لڑکی کو اس کے مسلمان ہمسائے نے اغوا کر لیا تھا۔ بعد میں اس کے والدین کو معلوم ہوا کہ اسے ایک مدرسے میں قید رکھا گیا ہے۔ اس لڑکی کو زبردستی مسلمان کر کے اس کی شادی کر دی گئی تھی۔

باغیوں یا غیر ملکی افواج یا دہشتگرد تنظیموں کی زیادتیاں:

زیادتیوں کے کئی ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جن میں ایسے افراد، تنظیمیں اور مذہبی گروہ ملوث رہے ہیں جنہیں امیگریشن اینڈ نیشنلٹی ایکٹ کی شق 219 کے تحت امریکی وزیر خارجہ دہشت گرد تنظیمیں قرار دے چکی ہیں۔ ان واقعات میں وہ مسلح فرقہ وارانہ گروپ بھی شامل رہے ہیں جن کے ایسی تنظیموں کے ساتھ روابط ہیں۔

اس رپورٹ کی تیاری کے عرصہ کے دوران ملک کے مختلف حصوں میں فرقہ وارانہ لڑائی جھگڑے جاری رہے۔ شیعہ اقلیت کو خاص طور پر کرم اور اورکزئی ایجنسیوں، گلگت، ڈیرہ غازی خان، ٹانک، کوہاٹ، ہنگو، کوئٹہ اور ڈیرہ اسماعیل خان میں حملوں کا نشانہ بنایا گیا۔ زیرنظر رپورٹ کی تیاری کے پورے عرصے کے دوران ملک بھر خصوصاً صوبہ خیبر پختونخوا میں اسلامی انتہاپسندوں کی طرف سے حملوں، دھمکیوں اور لڑائی جھگڑوں کا سلسلہ جاری رہا۔

اس رپورٹ کی تیاری کے دوران مذہبی اجتماعات، عبادت گاہوں اور فرقہ ورانہ، مذہبی انتہا پسندانہ اور دہشت گرد گروپوں کے مذہبی راہنماؤں پر حملوں کے نتیجے میں سینکڑوں افراد ہلاک ہوئے۔ اس سارے عرصے میں شیعہ اور سنی انتہا پسندوں کے مابین فرقہ وارانہ تشدد جاری رہا۔ ملک بھر میں مختلف مذہبی اقلیتوں کی آبادیوں اور افراد کو مذہبی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ان واقعات کی مثالیں درج ذیل ہیں:

20 فروری 2010ء کو شیعہ مخالف انتہا پسند تنظیم سپاہ صحابہ کے اراکین نے فیصل آباد میں بریلویوں کے ایک مذہبی جلوس کے دوران میں دیوبندی مظاہرین کے روپ میں جلوس پر فائرنگ کی جس کی وجہ جنگ و جدل کا بازار گرم ہو گیا۔ مشتعل ہجوم نے ایک مسجد، ایک گھر، ایک تھانے اور ایک دیوبندی جید عالم کے مدرسے کو آگ لگا دی۔ اس واقعے میں ایک شخص ہلاک اور بیس زخمی ہوئے۔

جنوری 2010ء میں جنگجوؤں نے اورکزئی ایجنسی کے علاقے ستوری خیل میں چھ مزاروں کو دھماکوں سے اڑا دیا اور ایک روحانی پیشوا کی میت کو قبر کھود کر باہر نکالا۔ مقامی لوگوں کے مطابق پوری طرح مسلح جنگجو ستوری خیل قبیلے کے علاقے میں آئے اور روحانی پیشوا انوار الحق کی قبر کھودی۔ انہوں نے میت کی باقیات نکالیں اور اپنے ساتھ لے گئے۔

27 دسمبر 2009ء کو کراچی میں شیعوں کے ایک مذہبی جلوس کے قریب سڑک کے کنارے بم دھماکہ ہوا جس کے نتیجے میں چھبیس افراد زخمی ہوئے۔ اس دھماکے کا ذمہ دار ایک دہشت گرد تنظیم لشکر جھنگوی کو ٹھہرایا گیا۔ 29 دسمبر 2009ء کو کراچی میں شیعوں کے ایک دوسرے مذہبی جلوس پر خودکش حملہ کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں پچیس افراد ہلاک اور پچاس سے زیادہ زخمی ہوئے۔ اس حملے کے بعد مشتعل افراد نے ہنگامہ آرائی کی۔ کئی نجی دکانوں اور سرکاری عمارتوں کو آگ لگا دی گئی۔ اس دھماکے کی ذمہ داری بھی لشکر جھنگوی پر عائد کی گئی۔

2 ستمبر 2009ء کو دو نامعلوم مسلح افراد نے وفاقی وزیر مذہبی امور حامد سعید کاظمی کے قافلے پر حملہ کیا۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں وفاقی وزیر کا محافظ ہلاک ہوا جبکہ انہیں ٹانگ پر گولی لگی۔ وفاقی وزیر حامد سعید کاظمی بریلویوں کے ایک بڑے مذہبی راہنما اور طالبان کے سخت ناقد ہیں۔ بریلوی رہنماؤں نے اس حملے کی ذمہ داری طالبان باغیوں پر عائد کی ہے۔

مذہبی رہنماؤں کو چن چن کر قتل کرنا کالعدم فرقہ ورانہ تنظیموں سپاہ صحابہ (ایس ایس پی)، دہشت گرد تنظیم لشکر جھنگوی (ایل جے) اور سپاہ محمد پاکستان (ایس ایم پی) سمیت کئی گروپوں کا وطیرہ رہا ہے۔ سپاہ صحابہ اور لشکر جھنگوی بریلویوں اور شیعہ افراد کو نشانہ بناتے ہیں جبکہ سپاہ محمد پاکستان دیوبندیوں کو نشانہ بناتی ہے۔

مذہبی آزادی کے حوالے سے بہتری اور مثبت اقدامات:

اس رپورٹ کی تیاری کے عرصے میں حکومت نے مذہبی آزادی کو مستحکم کرنے کے لئے کئی اقدامات اٹھائے۔

اٹھارہویں ترمیم کی رو سے حکومت نے سینیٹ میں چاروں صوبوں کے لئے ایک ایک اقلیتی نشست مختص کی ہے۔ اقلیتی گروپوں نے اس پیش رفت کا خیر مقدم کیا ہے۔

جیلوں کے اندر اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے قیدیوں کو عبادت کے لئے جگہیں فراہم کی گئی ہیں۔ حکومت تمام اقلیتوں کو ان کے مقدس

تہواروں اور دِنوں کو منانے کے مواقع پر زیادہ حفاظتی سہولیات فراہم کر رہی ہے۔

جولائی اور اگست 2009ء میں گوجرہ اور کوڑیاں میں عیسائیوں پر حملوں کے بعد قومی اسمبلی کی سٹینڈنگ کمیٹی برائے اقلیتی امور نے توہین رسالت کے قوانین کا جائزہ لینے اور اس میں تبدیلیوں کی سفارش کرنے کیلئے ایک سب کمیٹی تشکیل دی۔ رکن قومی اسمبلی نفیسہ شاہ کی سربراہی میں اس سب کمیٹی نے اِنسانی حقوق کی تنظیموں اور اقلیتی گروپوں کے نمائندوں کے ساتھ کئی مشاورتی اجلاس کئے۔ اور ان قوانین کے تباہ کن اثرات کو ختم کرنے کی تجاویز پر غور کیا۔

اس رپورٹ کی تیاری کے عرصے میں صوبہ سندھ میں پولیس نے جبری مشقت سے دو چار ڈیڑھ ہزار افراد کو رہا کرایا۔ ان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔

انٹرنیشنل کرسچین کونسل کے مطابق 2 جون 2010ء کو پولیس نے رائے وِنڈ میں اینٹوں کے بھٹے پر کام کرنے والے ایک عیسائی خاندان کو رہا کرایا جسے ایک سال سے قید میں رکھا گیا تھا۔ آئی سی سی نے بتایا کہ بھٹے کے مسلمان مالک محمد نواز نے اصغر مسیح، اس کی بیوی ریحانہ بی بی اور تین بچّوں کو بھٹے پر قید کر رکھا تھا۔ آئی سی سی کے مطابق نواز، ریحانہ اور اس کی بڑی بیٹی کے ساتھ زنا بالجبر کرتا رہتا تھا اور اس نے سب کو زنجیروں سے باندھ رکھا تھا تا کہ وہ بھاگ نہ سکیں۔ تاہم ایک دن اصغر مسیح بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے پاکستانی حکام کو اطلاع دی۔ جس پر پولیس نے اینٹوں کے بھٹے پر چھاپہ مار کر اس مظلوم خاندان کو رہائی دلائی اور نواز کو گرفتار کر لیا۔

اپریل 2010ء میں صدر آصف علی زرداری نے وزارت اقلیتی امور میں ''ہاٹ لائن'' قائم کرنے کا اعلان کیا تا کہ ملک بھر میں مذہبی اقلیتوں کے خلاف کسی بھی تشدد یا سنگین حملے کی براہ راست اطلاع دی جا سکے۔ اس ہاٹ لائن کا ایک کنکشن صدر کے پاس بھی ہو گا تا کہ متاثرہ اقلیتی لوگ حملے اور تشدد کی ہنگامی صورت حال میں رابطہ کر سکیں۔

دسمبر 2009ء میں کرسمس کے عشائیے کے موقعہ پر وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے اُن پانچ سو عیسائی خاندانوں کے گھر تعمیر کرنے کیلئے پلاٹ دینے کا اعلان کیا جنہیں کچی آبادی میں رہنے کی وجہ سے چک شہزاد سے نکالا گیا تھا اور جو اسلام آباد میں کھلے آسمان تلے رہنے پر مجبور تھے۔ اس موقعہ پر انہوں نے مسیحیوں کی درخواست پر یہ اعلان بھی کیا کہ عیسائیوں کو آئندہ ''مسیحی'' (یعنی مسیحؑ کے پیروکار) کہہ کر پکارا جائے گا۔

حکومت نے اقلیتی گروپوں کے دس مذہبی تہواروں کو قومی سطح پر منانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ علاوہ ازیں وزارت اقلیتی امور، مذہبی اداروں اور غیر سرکاری تنظیموں نے اقلیتی گروپوں کے خلاف تشدد کو روکنے کی کوشش کے طور پر مختلف مذاہب کے مابین ملاقاتوں اور بات چیت کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ احمدیوں نے وزارت اقلیتی امور کے زیر اہتمام ہونے والے اس نوعیت کے پروگراموں کا بائیکاٹ کیا کیونکہ وہ خود کو ایک مسلمان فرقہ سمجھتے ہیں۔

سیکشن III۔ مذہبی آزادی کا معاشرتی احترام:

مختلف مذہبی گروہوں کے مابین تعلقات کشیدہ رہے۔ مذہبی اقلیتی گروہوں کے خلاف اور مسلمان فرقوں کے درمیان لڑائی جھگڑے

اور تشدد جاری رہا۔ زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ ایک چھوٹی سی اقلیت ان حملوں میں ملوث ہے تاہم امتیازی قوانین اور مذہبی عدم برداشت کی تعلیم کی وجہ سے اس طرح کے حملوں کے لئے سازگار ماحول تشکیل دینے میں مدد ملی ہے۔ اکثر و بیشتر پولیس دھونس، دھمکیوں اور تشدد کو روکنے اور اس طرح کے جرائم میں ملوث افراد کے خلاف کارروائی کرنے سے احتراز کرتی ہے۔ عام طور پر اقلیتی گروپوں کی جانب سے مذہب قبول کرنے کے واقعات معاشرتی سطح پر جوابی کارروائی کے خوف سے خفیہ طور پر منعقد کئے جاتے ہیں۔

انٹرنیشنل کرسچین کونسل کے مطابق جون 2010ء میں ضلع خانیوال پنجاب میں مسلمانوں کے ایک گاؤں کچا کھوہ کے سرکردہ افراد نے علاقے میں آباد ڈھائی سو عیسائی خاندانوں کو اپنے گھر بار چھوڑ کر چلے جانے کا حکم دیا۔ ان عیسائیوں کو یہ حکم اس لئے دیا گیا کہ وہ مبینہ طور پر مسلمانوں کی طرف سے عیسائی لڑکیوں اور عورتوں پر مجرمانہ حملوں پر شدید احتجاج کرتے تھے۔ ان خاندانوں نے اس خوف کی وجہ سے پولیس سے رجوع نہیں کیا کہ ان پر توہین رسالت کے الزام کے تحت جھوٹے مقدمات درج کر لئے جائیں گے۔

آئی سی سی کے مطابق 3 جون 2010ء کو ساہیوال پاکستان میں چودہ انتہا پسند مسلمانوں نے ایک پادری ممتاز مسیح، اس کی حاملہ بیوی نورین اور اس کے بھائی پر حملہ کر دیا۔ ان پر مسیحیت کی تبلیغ کرنے کا الزام تھا۔

سی ڈی این کے مطابق 13 اپریل 2010ء کو سرگودھا کے علاقے گلشن بشیر میں ایک عیسائی حجام مروت مسیح کو ایک انیس سالہ مسلمان نوجوان قندیل چیمہ کی داڑھی مونڈنے کی وجہ سے آٹھ مسلمانوں نے مارا پیٹا اور اس کے ساتھ بدفعلی کی۔ قندیل چیمہ نے مروت مسیح کو بتایا تھا کہ وہ اب لاہور میں پڑھتا اور رہتا ہے اور اپنی وضع قطع جدید طرز پر کرنا چاہتا ہے۔ کچھ ہچکچاہٹ کے بعد مروت مسیح نے اس کی داڑھی مونڈ دی۔ قندیل چیمہ کا بڑا بھائی شکیل چیمہ اس حملے کے موقعہ پر موجود تھا۔ شکیل اور اس کے سات ساتھیوں نے مروت مسیح کو پکڑا، مارا پیٹا، اس ٹانگیں، پسلیاں اور کلائی کی ہڈیاں توڑ دیں۔ اس کے بعد آٹھوں افراد نے اس کے ساتھ بدفعلی کی۔ اس رپورٹ کی تیاری کا عرصہ ختم ہونے تک پولیس شکیل چیمہ اور اس کے ساتھیوں کے خلاف ایف آئی آر درج کرنے سے انکاری ہے۔

سی ڈی این کے مطابق 5 اپریل 2010ء کو ثانیہ جیمز نامی ایک عیسائی خاتون کو بندوق کی نوک پر اغوا کر کے ایک مسلمان کسان محمد شہباز علی کے ساتھ زبردستی اس کی شادی کر دی گئی۔ ثانیہ کے والد جیمز ایوب نے اپنے سابق آجر محمد شہباز علی سے اپنی بڑی بیٹی کی شادی کے لئے قرض لیا تھا۔ مسلح افراد نے مبینہ طور پر اس کے والد کو کہا کہ جب تک وہ ڈھائی لاکھ روپے (تقریباً دو ہزار نو سو تیس ڈالر) کا قرض اور تیس فیصد سود واپس نہیں کرتا، وہ اپنی بیٹی کی شکل نہیں دیکھ سکے گا۔ ثانیہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

اسسٹ نیوز سروس کے مطابق 28 اگست 2009ء کو ایک چودہ سالہ عیسائی لڑکی سدرہ سرور کو بندوق کی نوک پر تین مسلمان افراد نے اغوا کر کے زنا بالجبر کا نشانہ بنایا۔ جب وہ حاملہ ہو گئی تو ملزمان میں سے ایک شخص محمد خالد نے مقدمہ سے بچنے کے لئے اس سے شادی کر لی۔ وہ 20 دسمبر 2009ء کو فرار ہو کر اپنے خاندان سے آ ملی۔ پولیس نے 13 مئی 2010ء کو تینوں افراد کو بیگناہ قرار دے دیا۔ اس لڑکی اور اس کے خاندان کو ابھی تک دھمکیاں مل رہی ہیں۔

5 اگست 2009ء کو کاٹھیالہ گاؤں میں مرید کے شیخوپورہ روڈ پر واقع چمڑے کے ایک کارخانے میں اُس کے مالک اور ایک مزدور کو قتل کر دیا گیا۔ اس واقعے میں درجن بھر مزدور زخمی بھی ہوئے۔ فیکٹری میں کام کرنیوالے کچھ لوگوں نے مالک پر الزام عائد کیا تھا کہ اُس نے قرآن

مجید کے صفحے پھاڑ کر اُس کی بے حرمتی کی ہے۔

اکثر و بیشتر مشتعل ہجوم ان افراد اور ان کے خاندانوں اور ہم مذہب لوگوں پر حملے کرتے ہیں جن پر توہین رسالت کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ جب توہین اور دیگر مذہبی نوعیت کے مقدمات کی سماعت ہونے لگتی ہے تو انتہا پسند عدالتوں میں اکٹھے ہو جاتے ہیں اور رہائی کی صورت میں سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ مذہبی انتہا پسند توہین کے مقدمات میں رہا ہونے والے افراد کو قتل کی دھمکیاں دیتے رہتے ہیں۔ رہائی کے بعد ایسے افراد کو روپوش ہونا یا بیرون ملک منتقل ہونا پڑتا ہے۔

احمدی افراد اور اداروں کو ایک عرصے سے مذہبی تشدد کا سامنا ہے جو کہ زیادہ تر مذہبی انتہا پسندوں کی طرف سے ہوتا ہے۔ احمدیہ کمیونٹی کے ایک ترجمان کے مطابق 1984ء میں احمدی مخالف قوانین کی تشکیل کے بعد سے ایک سو آٹھ احمدیوں کو مذہبی وجوہات کی بنیاد پر قتل کیا جا چکا ہے۔

ستمبر 2009ء میں کراچی میں علماء نے اعلان کیا کہ وہ گیارہ ستمبر کو یوم احتجاج منائیں گے کیونکہ احمدی ایک فتنہ اور توہین رسالت کے مرتکب ہیں۔

13 جون 2010ء کے انڈیا ٹوڈے کے مطابق لاہور میں ایک احمدی کی ملکیت شیزان فیکٹری سے باہر دھماکہ خیز مواد پھٹنے سے دو افراد زخمی ہو گئے۔ پولیس اس امر کی تفتیش کر رہی ہے کہ آیا یہ حملہ احمدیوں کو نشانہ بنانے کے لئے تو نہیں تھا۔

31 مئی 2010ء کو نارووال میں عباد بٹ نامی ایک شخص نے ایک پچپن سالہ احمد نعمت اللہ احمد اور اس کے بیٹے منصور احمد پر خنجر سے حملہ کیا اس حملے کے نتیجے میں نعمت اللہ احمد موقعہ پر ہلاک ہو گیا جبکہ منصور کو ہسپتال داخل کرا دیا گیا۔ حملہ آور یہ کہتے ہوئے فرار ہو گیا کہ وہ کسی احمدی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

19 مارچ 2010ء کو کوئٹہ میں افتخار الحق نامی ایک احمدی وکیل کو کچھ لوگوں نے بندوق کی نوک پر اغوا کیا اور اس سے دس کروڑ روپے (تقریباً گیارہ لاکھ ستر ہزار ڈالر) تاوان طلب کیا۔ اغوا کرنے والوں کا الزام تھا کہ وہ احمدی لٹریچر تقسیم کرتا اور لوگوں کو احمدی مذہب میں داخل کرتا ہے۔ اسے کہا گیا کہ وہ احمدی سرکاری افسروں اور تاجروں کے نام بتائے۔ 17 اپریل کو اُسے تیس لاکھ پچاس ہزار روپے (پینتالیس ہزار ڈالر) ادا کر کے رہا کرا لیا گیا۔

ایشین ہیومن رائٹس کمیشن کے مطابق 5 جنوری 2010ء کو لاہور میں دو نقاب پوش مسلح موٹر سائیکل سواروں نے محمد یوسف نامی ایک ستر سالہ ریٹائرڈ پروفیسر پر فائرنگ کر دی۔ زخمی ہسپتال لے جاتے ہوئے دم توڑ گیا۔

صوبہ سندھ میں آباد ہندوؤں کا کہنا تھا کہ انہیں تاوان کے لئے اغوا کئے جانے والے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ خاص طور پر کراچی میں جرائم پیشہ عناصر ہندو تاجروں کو اغوا کرتے ہیں۔ ہندوؤں کا کہنا تھا کہ اس طرح کے اغوا کی وارداتوں میں پولیس کی عدم دلچسپی کے باعث انہیں مغویوں کو رہا کرانے کے لئے تاوان ادا کرنا پڑتا ہے۔

دی نیشن نے 4 مارچ 2010ء کو لکھا کہ ضلع تھر پارکر سندھ میں بڑھتی ہوئی بدامنی اور اغوا کی وارداتوں کے باعث پینسٹھ دلت خاندان (نچلی ذات کے ہندو) بے گھر ہوئے۔

5 ستمبر 2009ء کو کندھ کوٹ سندھ میں سکھوں اور ہندوؤں کی مشترکہ عبادت گاہ گرونانک دربار میں نامعلوم انتہاپسندوں نے سکھوں اور ہندوؤں کی مذہبی کتب کو نذرِ آتش کر دیا۔ اس واقعہ پر پورے سندھ میں ہندوؤں اور سکھوں میں سخت بے چینی پھیل گئی، پاکستان ہندو فاؤنڈیشن نے تین روزہ سوگ کا اعلان کیا اور اس کے بعد صوبہ بھر کے مختلف اضلاع میں ہندوؤں نے ہڑتال کی۔

فاٹا میں سکھوں پر حالیہ حملوں کے باوجود سماجی سطح پر سکھوں کے خلاف تشدد کی شرح نسبتاً کم رہی۔

اسماعیلیوں کا کہنا تھا کہ اپنی دولت وثروت کے باعث وہ سنی مسلمانوں کی نفرت کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ اسماعیلیوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ اکثر وبیشتر ان پر سماجی دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ وہ روایتی اسلامی تعلیمات قبول کر کے انہیں اپنالیں یا سماجی طور پر اچھوت بنے رہیں۔

کچھ سنی مسلمان گروپ ہندوؤں، احمدیوں، شیعوں اور دیگر سنی فرقوں کے خلاف تشدد کیلئے اکسانے والا مواد چھاپتے رہتے ہیں۔ کچھ اخبارات مذہبی اقلیتوں خصوصاً احمدیوں، ہندوؤں اور یہودیوں کے بارے میں توہین آمیز خیالات پر مشتمل مضامین شائع کرتے رہے ہیں۔ عام طور پر مذہب کی بنیاد پر روزگار کے مواقع کی فراہمی میں امتیاز برتا جاتا ہے۔ عیسائیوں کو عام مزدوری اور نچلے درجے کے کاموں کے سوا روزگار کے مواقع مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ بہرحال عیسائیوں کا کہنا تھا کہ حالیہ برسوں میں نجی شعبے میں عیسائیوں کے لئے روزگار مواقع کی فراہمی میں بہتری آئی ہے۔

سیکشن VI۔ امریکی حکومت کی پالیسی:

حکومت امریکہ انسانی حقوق کی اپنی پالیسی کو فروغ دینے سلسلہ میں پاکستانی حکومت سے مذہبی آزادی کے حوالے سے بات چیت کرتی ہے۔ امریکی سفارتخانہ اور قونصل خانوں کے حکام مذہبی آزادی کی حوصلہ افزائی کیلئے حکومت، مذہبی اور اقلیتی طبقوں کے نمائندوں سے توہین سے متعلق قوانین، سرکاری اسکولوں اور مدرسوں کے نصاب اصلاحات، احمدی اور مسیحی اقلیتوں سے سلوک اور فرقہ وارانہ تشدد کے حوالے سے مذاکرات کرتے رہے۔

افسران نے اقلیتوں کے حوالے سے انسانی حقوق کے کیسوں کی نگرانی اور تحقیقات کیں اور ان واقعات پر فوری اور مؤثر ردعمل ظاہر کرنے اور اقلیتی گروہوں کو باقاعدہ تحفظ فراہم کرنے اور اس تک رسائی کیلئے حکومتی اہلکاروں پر زور دیا۔

28 مئی 2010ء کو لاہور میں احمدیوں کی مسجد پر حملوں کے بعد امریکی محکمۂ خارجہ، سفارتخانہ اور لاہور میں واقع قونصل خانہ نے ان حملوں کی کھلی مذمت کی اور ان کی صحیح تحقیقات کا مطالبہ کیا۔

سفیر سمیت سفارتخانہ کے اہلکاروں اور دورے پر آنے والے محکمۂ خارجہ کے حکام نے حکومت کے افسروں کے علاوہ اقلیتی گروپوں کے راہنماؤں اور مذہبی آزادی کے معاملات پر کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیموں کے نمائندوں کے ساتھ ملاقاتیں کیں۔ مثال کے طور پر اکتوبر

2009ء میں وزیرخارجہ کلنٹن نے اپنے دورۂ پاکستان کے دوران اسلام آباد میں بری امام کے مزار پر حاضری دی۔ انہوں نے لاہور میں سترہویں صدی کی بادشاہی مسجد کے امام سے بھی ملاقات کی۔ گلوبل افیئرز کے نائب وزیرخارجہ اوٹیرو نے اقلیتی راہنماؤں کے ساتھ ایک گول میز اجلاس کی صدارت کی۔ سفارتخانہ اور قونصلیٹ کے اہلکاروں نے پاکستانی مذہبی اور سول سوسائٹی کی تنظیموں کے زیراہتمام بین المذاہب مباحثے میں شرکت کی۔

سفارتخانہ کے حکام نے اراکین پارلیمنٹ کے ساتھ احمدیوں، ہندوؤں اور مسیحیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کا معاملہ اٹھایا۔ رمضان المبارک کے دوران سفارتخانہ اور قونصلیٹ کے حکام نے کئی افطار پارٹیاں منعقد کیں۔

دسمبر 2009ء میں سفارتخانہ کے حکام نے اڈیالہ جیل میں کرسمس کی تقریب میں شرکت کی۔ جنوری 2010ء میں فلپائن کے آرچ بشپ کے اعزاز میں ایک انٹرفیتھ استقبالیہ دیا اور مارچ 2010ء میں ہندوؤں کے مذہبی تہوار "ہولی" کا اہتمام کیا۔

سفارتخانہ نے مذہبی مسائل پر تقریر کیلئے اسلام آباد، کراچی اور لاہور میں تین مقررین کی میزبانی بھی کی۔ جارج ٹاؤن یونیورسٹی کے چیپلن امام یحییٰ ہندی نے "امریکہ میں اسلام" کے موضوع پر خطاب کیا۔ انہوں نے اسلام آباد اور کراچی میں مذہبی راہنماؤں، مدارس کے کرتا دھرتا افراد، اسلامی نظریاتی کونسل کے اراکین، طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ تبادلۂ خیال کیا۔ کلیرئنس لوسین نے اقلیتوں کے حقوق پر خطاب کیا اور مذہبی علماء سے ملاقات کی۔ صفیہ غوری نے اسلام اور خواتین کے موضوع پر مختلف سامعین کے ساتھ بات چیت کی۔

###